AHM-3

سُرخ تیر کے قیدی

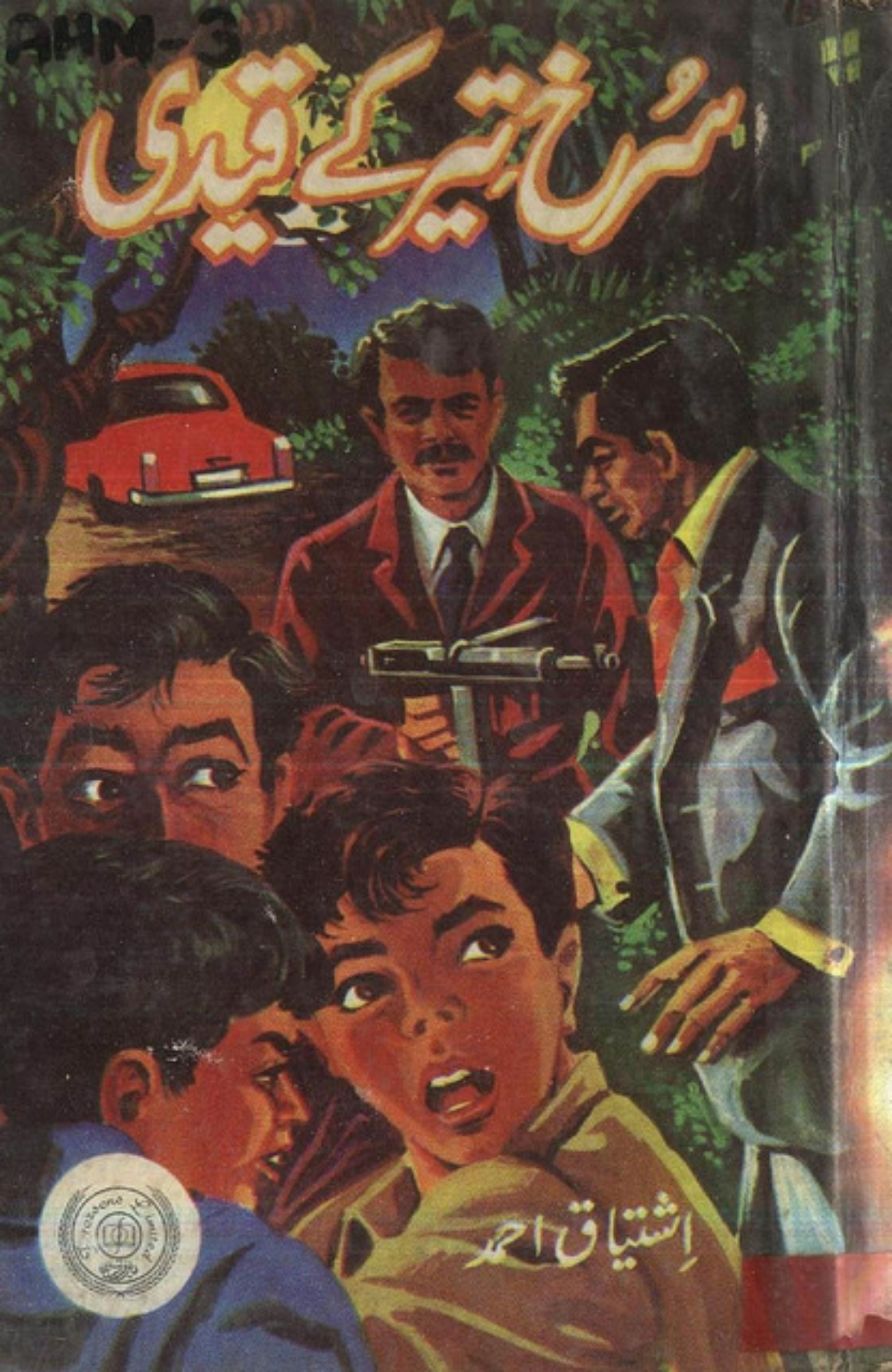

اِشتیاق احمد

سُرخ تیر: پہلا حصّہ

یشوما اور سُرخ تیر

بچّوں کے لیے ناول

سُرخ تیر: تیسرا حصّہ

سُرخ تیر کے قیدی

بچّوں کے لیے ناول

سُرخ تیر: چوتھا حصّہ

سُرخ تیر کی وادی میں

بچّوں کے لیے ناول

سُرخ تیر: دوسرا حصّہ

سُرخ تیر کا شکار

بچّوں کے لیے ناول

جنگل میں

"خبردار! کوئی حرکت کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ کار کے خانے میں سے وہ چیزیں نکال کر میرے حوالے کر دو۔" مشین گن والے نے کہا۔

"کون سی چیزیں؟" کامران مرزا نے انجان بن کر کہا۔

"وہی، جو تم پروفیسر جیلانی کے پاس لے جا رہے ہو۔" اُس نے غرّا کر کہا۔

"اوہ! وہ چیزیں.... تو تمھیں معلوم ہے؟"

"ہاں۔ ہم سب کچھ جانتے ہیں۔ زیادہ عقل مند بننے کی کوشش نہ کرنا، ورنہ سینہ گولیوں سے چھلنی ہو جائے گا۔"

"ارے باپ رے!" آفتاب نے ڈرے ڈرے انداز میں کہا۔ آصف اور فرحت بھی تھر تھر کانپنے لگے۔

کامران مرزا نے جیب میں ہاتھ ڈال کر خانے کی چابی نکالی اور اسے سوراخ میں داخل کر کے گھمانے لگے، لیکن خانہ نہ کھلا۔ ایک منٹ کی کوشش کے بعد وہ بڑبڑائے:

"نہ جانے کیا بات ہے! خانہ کھل ہی نہیں رہا۔"

"تم باہر آ جاؤ۔ ہم خود کھول لیں گے۔"

چاروں کار سے اُتر آئے۔ ساتھ ہی ان کے سینوں سے پستولوں کی نالیں آ لگیں۔ بچّے بدستور کانپ رہے تھے، البتّہ کامران مرزا پُرسکون انداز میں کھڑے تھے۔

"ارے! یہ لوگ تو کانپ رہے ہیں! ہم نے مشین گن لانے کی یُوں ہی تکلیف کی۔ ان لوگوں کے لیے تو ایک پستول ہی کافی تھا۔" مشین گن والے نے کہا اور کار میں بیٹھ کر خانہ کھولنے کی کوشش کرنے لگا، لیکن تین چار منٹ کی لگاتار کوشش کے باوجود بھی وہ اسے کھولنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ آخر اس نے جھنجھلا کر کہا:

"کیا مصیبت ہے۔ نہیں کھلتا۔ اب ان لوگوں کو اڈّے پر ہی لے جانا ہو گا۔"

"انھیں لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ صرف کار لے جاتے ہیں۔" اس کے ایک ساتھی نے کہا۔

"ان کی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے۔ ان کی آنکھوں پر ربڑ کی پٹیاں چڑھا دو۔"

"ارے بھائی، اس کی کیا ضرورت ہے۔ ہم خود ہی آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔" آفتاب نے گھبرا کر کہا۔

کتاب پر کچھ لکھنے - گم ہو جانے یا پھٹ جانے [illegible]
[illegible] قیمت اور [illegible]

"خاموش رہو، ورنہ زبان کاٹ دی جائے گی۔" مشین گن والے نے کہا۔

"بب.... بہت اچھا" اس نے ہکلا کر کہا "میں کٹی ہوئی زبان سے بہت ڈرتا ہوں۔"

فوراً ہی ان چاروں کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی گئیں۔ دو منٹ بعد انھیں کار میں بٹھا کر لے جایا جا رہا تھا۔ آفتاب، آصف اور فرحت حیران رہ گئے۔ ابھی تو کامران مرزا نے کہا تھا کہ مجرم خود انھیں اپنے ٹھکانے پر لے جائیں گے اور اب یہی ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ خانے میں خرابی انھوں نے خود پیدا کی تھی۔

سفر تقریباً تین گھنٹے جاری رہا۔ اس کے بعد انھوں نے محسوس کیا کہ کار مڑ گئی ہے اور اب کچے راستے پر چل رہی ہے۔ آخر یہ کچا راستہ بھی ختم ہوا۔ کار رک گئی۔ انھوں نے مشین گن والے کی آواز سنی:

"نیچے اُتر آؤ!"

"کیسے نیچے اُتریں؟ ہماری آنکھوں پر تو پٹیاں بندھی ہیں۔ سچ مچ کی پٹیاں۔ ویسے اس سے پہلے ہم محاورے کے طور پر یہ بولتے اور سنتے رہے ہیں کہ تمھاری آنکھوں پر تو پٹی بندھی ہے۔" آفتاب نے کہا۔

"ٹرٹر نہ کرو۔ پٹیاں بھی اُتر جائیں گی۔"

وہ کار سے نیچے اُتر آئے۔ مشین گن والے کے ساتھیوں نے ان کی آنکھوں پر سے پٹیاں اُتار دیں۔ اُنھوں نے دیکھا، وہ ایک گھنے جنگل میں تھے۔ چاروں طرف اُونچے اُونچے درخت کھڑے تھے۔ سُورج غروب ہونے کے قریب تھا اور جنگل میں ابھی سے اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔

"تم تینوں کاروں کو خفیہ جگہ پہنچا کر اڈّے پر آ جاؤ۔ میں اِنھیں لے کر چلتا ہوں۔" مشین گن والے نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

اُنھوں نے سر ہلائے اور ایک ایک کار میں بیٹھ گئے۔ مشین گن والا انھیں ایک سمت میں لے چلا۔ بچے حیران تھے کہ آخر مُنوّر علی خاں کہاں رہ گئے؟

فرحت نے ان کے بارے میں کامران مرزا سے پُوچھنے کے لیے ہونٹ کھولے ہی تھے کہ اسے وقت پر خیال آ گیا۔ وہ ان لوگوں کے سامنے اُن کے متعلق نہیں پُوچھ سکتی تھی۔ دُوسری طرف کامران مرزا بھی فرحت کے اِرادے کو بھانپ گئے تھے۔ اُنھوں نے آنکھ کے اِشارے سے اسے خاموش رہنے کی ہدایت کی۔ کوئی پانچ منٹ تک درختوں میں سے گزرنے کے بعد انھیں ایک بہت بڑی کھنڈر نما عمارت دکھائی دی۔ وہ سمجھ

گئے کہ یہی مجرموں کا اڈّا ہے۔

عمارت کی کئی دیواریں گر چکی تھیں۔ شاید یہ کوئی پُرانا شاہی محل تھا۔ اندر داخل ہونے پر بہت سے طاقوں میں انھیں مُورتیاں نظر آئیں۔ جس بادشاہ نے اس محل کو تعمیر کرایا ہوگا، وہ ضرور ہندو ہوگا۔

ایک گرے ہوئے دروازے سے گزرنے کے بعد وہ ایک صحیح سلامت کمرے میں آئے۔ یہ ایک بہت بڑا ہال تھا۔ اور اس میں کوئی سامان نہ تھا۔ وہ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس کمرے کے بعد وہ ایک اور کمرے میں داخل ہوئے۔ یہاں بھی کوئی چیز نہ تھی۔ کمرا خالی تھا۔

"تم لوگ یہاں بیٹھو۔ میرے ساتھی آ لیں، پھر ہم اندر چلیں گے۔" مشین گن والے نے کہا۔

وہ فرش پر بیٹھ گئے۔ فرش پر گرد کی موٹی تہہ جمی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے برسوں سے کسی نے اس عمارت میں قدم نہ رکھا ہو۔

ان کی حیرت لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ اگر مجرموں کا اڈّا یہی تھا تو یہاں رہائش کے آثار ہونے چاہئیں تھے، جب کہ انھیں کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی تھی۔ جلد ہی اُنھوں نے قدموں کی چاپ سُنی۔ مشین گن والے

کے ساتھی واپس آ رہے تھے۔ اُن کے واپس آتے ہی وہ بولا:

"یہ مشین گن تم سنبھالو۔ میں تہہ خانے کا دروازہ کھولتا ہوں۔"

یہ جُملہ سُنتے ہی کامران مرزا چونک اُٹھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اس محل نُما عمارت کے نیچے کوئی تہہ خانہ بھی ہو سکتا ہے۔ مجرموں کے ٹھکانے پر پہنچنے کا یہ پروگرام اُنھوں نے مُنوّر علی خان کو سامنے رکھ کر بنایا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مجرموں کا ٹھکانا شہر ہی میں ہو گا۔ اس گھنے جنگل میں ایک کھنڈر کے نیچے تہہ خانے کا انھیں خیال بھی نہ آیا تھا۔ اب اگر وہ تہہ خانے میں پہنچ جاتے تو مُنوّر علی خاں کا اُن تک پہنچنا بالکل ناممکن نظر آتا تھا، کیوں کہ اس عمارت کی حیثیت ایک کھنڈر سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ اُنھوں نے اس وقت کچھ کر گزرنے کے بارے میں سوچا، لیکن وقت گزر چکا تھا۔ مشین گن کا رُخ ان کی طرف تھا۔ اور دو پستولوں کی نالیں بھی اُن کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ مشین گن والا اس کمرے سے نکل کر غائب ہو چکا تھا۔

فوراً ہی اُنھوں نے گڑگڑاہٹ کی آواز سُنی۔ پھر مشین گن والا وہاں آیا اور انھیں چلنے کا اِشارہ کیا۔

وہ اُٹھ کر ان لوگوں کے آگے آگے چلنے لگے۔ جوں ہی وہ کمرے سے نکلے، انھیں ایک اور ہال کی دیوار نظر آئی۔ اس دیوار میں ایک دروازہ تھا۔

"نیچے اُترو۔" انھیں حکم دیا گیا۔

کامران مرزا دروازے پر پہنچے تو انھوں نے دیکھا، سیڑھیاں نیچے اُتر رہی تھیں۔ وہ بے جھجک اندر داخل ہو گئے اور نیچے اُترنے لگے۔ بچّے بھی اُن کے پیچھے قدم اُٹھا رہے تھے۔ آخری سیڑھی اُترنے کے بعد انھیں اپنے سامنے ایک طویل برآمدہ نظر آیا۔ برآمدے کے دونوں طرف کمرے تھے۔ ایک بلب برآمدے میں روشن تھا۔

آخر انھیں ایک کمرے میں لایا گیا۔ پھر جوں ہی وہ کرسیوں پر بیٹھے، ایک آواز کمرے میں گونجی:

"اُستاد! یہ تم کن لوگوں کو یہاں لے آئے ہو؟"

مشین گن والے کے دونوں ساتھی جیپ کاریں خفیہ جگہ چھپا کر چلے گئے تو کامران مرزا کی کار کی ڈکی آہستہ آہستہ کھلنے لگی، اور پھر اس میں سے مُنوّر علی خاں باہر نکلے۔ وہ تو دراصل شروع ہی سے ان کے ساتھ آ رہے تھے۔ ڈکی ان کے لیے خاص طور پر تیار کرائی گئی تھی اور اسے

اندر سے بند کرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ ساتھ ہی اس میں ننھے ننھے سوراخ بھی بنا دیے گئے تھے تاکہ دم نہ گھٹے۔

کامران مرزا کا پروگرام تھا کہ جوں ہی مجرموں کے ساتھ وہ اُن کے ٹھکانے تک پہنچ جائیں تو مُنوّر علی خاں ڈکی میں سے نکل کر ان کی مدد کو آ جائیں۔

مُنوّر علی خاں نے دو تین انگڑائیاں لے کر اپنا بدن سیدھا کیا۔ پھر اُنھوں نے اِردگرد دیکھا۔ بڑھتے ہوئے اندھیرے میں چاروں طرف سوائے لمبے لمبے گھنے درختوں کے اور کچھ نظر نہ آیا۔ وہ پریشان ہو گئے اور سوچنے لگے کہ نہ جانے مجرم ان کے ساتھیوں کو کس طرف لے گئے ہیں۔ آخر انھیں ایک تدبیر سوجھی۔ وہ بندر کی سی پھرتی سے ایک درخت پر چڑھ گئے۔ اُوپر پہنچ کر انھوں نے چاروں طرف دیکھا، لیکن گھنے درختوں اور اندھیرے کی وجہ سے کسی عمارت کے آثار نظر نہ آئے۔ مایوس ہو کر وہ نیچے اُتر آئے اور ایک سمت میں چلنے لگے۔

کچھ دُور جا کر وہ پھر ایک درخت پر چڑھے اور چاروں طرف دیکھا۔ اب بھی انھیں ناکامی ہوئی، لیکن اُنھوں نے ہمت ہارنا نہیں سیکھا تھا۔ اور اس وقت تو یوں بھی مُعاملہ ان کے دوست اور بچّوں کا ہی نہیں، مُلک کی سلامتی

کا بھی تھا۔

صرف پندرہ منٹ میں وہ چوتھے درخت پر چڑھ رہے تھے۔ وہ اپنی زندگی میں نہ جانے کتنے درختوں پر چڑھ چکے تھے اور اس کام میں کافی ماہر تھے۔

اچانک اُنھوں نے ایک زبردست پھُنکار کی آواز سُنی۔ ان کی زندگی کے تجربات نے اُنھیں فوراً ہی بتا دیا کہ یہ پھُنکار سیاہ ناگ کی ہے۔

قید خانہ

"جناب، یہ کامران مرزا اور اُن کے بچّے ہیں۔ انھی لوگوں کی وجہ سے یہ دھما چوکڑی مچی ہے۔" مشین گن والے نے، جسے آواز نے اُستاد کے نام سے پکارا تھا، بڑے ادب سے کہا۔

"لیکن تم انھیں یہاں کیوں لائے ہو؟ تمھیں تو ان سے وہ چیزیں حاصل کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔" آواز نے پوچھا۔

وہ حیران ہو کر چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ بولنے والا نظر نہیں آ رہا تھا۔ آواز کمرے کی دیواروں میں سے آتی معلوم ہو رہی تھی۔

"جناب، وہ چیزیں ان کی کار کے ایک خانے میں تھیں۔ وہ کھُل نہیں سکا۔ لہٰذا میں انھیں کار سمیت یہاں لے آیا۔ اب ہم خانہ توڑ کر وہ چیزیں حاصل کر لیں گے، اور ان کے بارے میں آپ جو فرمائیں گے کیا جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ ان لوگوں کو قید خانے میں بند کر دو اور کار کے خانے سے وہ چیزیں نکال کر میرے سامنے پیش کرو۔"

"جی، بہت بہتر۔" اُستاد نے کہا، اور آواز آنی بند ہو گئی۔

"چلو اٹھو!" اُستاد نے غرّا کر کہا۔

چاروں نے چُپ چاپ تعمیل کی۔ کمرے سے نکل کر وہ برآمدے میں چلنے لگے۔ موڑ مڑتے ہی پھر سامنے برآمدہ تھا۔ اسی طرح کئی برآمدے طے کرنے کے بعد وہ ایک بہت بڑے دروازے کے سامنے پہنچے۔ جب وہ اس کے اندر داخل ہوئے تو اُنھوں نے دیکھا کہ دونوں طرف چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں بنی ہیں، جن میں لوہے کی سلاخوں والے دروازے لگے ہیں۔ بالکل جیل کی کوٹھڑیوں کی طرح۔

اُستاد نے جیب سے چابی نکال کر ایک کوٹھڑی کا دروازہ کھولا اور انھیں اندر داخل ہونے کا اِشارہ کیا۔ اس وقت آفتاب، آصف اور فرحت نے کچھ کرنے کے لیے کامران مرزا کی طرف دیکھا، لیکن اُنھوں نے اِنکار میں سر ہلایا اور چُپ چاپ کوٹھڑی میں داخل ہو گئے۔ ان کے پیچھے تینوں بھی اندر چلے گئے۔ اُستاد نے دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا اور یہ کہہ کر چلا گیا:

"جیل خانے کا نگران کھانا پہنچا دے گا۔ اب تم آرام کرو۔"

"آرام!" آفتاب نے بڑبڑا کر کوٹھڑی کو دیکھا۔ اس کا فرش پختہ تھا۔ چھت بہت نیچی تھی۔ وہ بمشکل کھڑے ہو سکتے تھے۔ آخر بیٹھ گئے۔

"تو آج رات ہمیں اس تنگ کوٹھڑی کے ننگے فرش پر لیٹنا ہوگا۔" آصف نے کہا۔

"یہاں تمھارے لیے نرم گرم بستروں کا انتظام کیسے کیا جا سکتا ہے۔"

"بستروں سے زیادہ مجھے تو بھوک ستا رہی ہے۔" فرحت بولی۔

"جب وقت ہوگا یہ لوگ خود ہی کھانا دے جائیں گے۔" کامران مرزا بولے۔

"لیکن ابّو، ہمیں بھوک اس وقت لگ رہی ہے۔"

"اچھا ٹھہرو، میں کچھ کرتا ہوں۔" کامران مرزا نے کہا اور سلاخوں کو زور زور سے کھٹکھٹانے لگے۔ جلد ہی ایک آدمی کوٹھری کے دروازے پر نمودار ہوا۔ اور کرخت آواز میں بولا:

"کیا ہے؟ کیوں شور مچا رہے ہو؟"

"ہمیں بھوک لگی ہے۔" آفتاب بولا۔

"کھانا وقت پر ملے گا۔" اس نے کہا۔

"سنو، تمھارا نام کیا ہے؟" کامران مرزا نے سوال کیا۔

"کیوں؟ تم نے میرا نام کیوں پوچھا؟" اس نے انھیں گھور کر دیکھا۔

"بس یوں ہی۔ مجھے تمھارا چہرا کچھ جانا پہچانا سا لگ رہا ہے۔"

"پہلے تم بتاؤ، تم کون ہو؟"

"میں کامران مرزا ہوں۔"

"کیا!!!" وہ چیخنے کے انداز میں بولا۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں "تو آپ بھی یہاں آ پھنسے! میں رمضان ہوں، سب انسپکٹر رمضان۔" اس نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

"اوہ! اب یاد آیا۔ تم پولیس میں ملازم تھے۔ تین سال پہلے غائب ہو گئے تھے۔ تو تم بھی ملک کے غدار ہو۔" یہ کہتے ہوئے کامران مرزا کے ہونٹ نفرت سے بھنچ گئے۔

"میں غدار نہیں۔ مجھے تو اغوا کر کے لایا گیا ہے۔"

"اوہ! آخر یہ لوگ چاہتے کیا ہیں؟"

رمضان کے کچھ بولنے سے پہلے ہی وہی آواز ابھری:

"انسپکٹر! اس بات کا علم یہاں سوائے میرے کسی کو

بھی نہیں کہ ہمارا مقصد کیا ہے۔ کھانے کا وقت ہو چکا ہے۔ کھانا کھا لو۔ اس کے بعد تمھیں میرے سامنے پیش ہونا ہے۔ رمضان، ان لوگوں کو ان کا کھانا پہنچا دو۔"

"جب.... بہت.... بہتر، جناب۔" رمضان نے جلدی سے کہا۔

سیاہ ناگ منوّر علی خاں سے صرف ایک فٹ اوپر پھن پھیلائے جھوم رہا تھا۔ اُس کی دُم ایک شاخ سے لپٹی ہوئی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ جوں ہی حرکت کریں گے، ناگ انھیں ڈس لے گا۔ لیکن وہ اس درخت پر اسی حالت میں کب تک کھڑے رہ سکتے تھے۔ انھیں کامران مرزا اور بچوں کا خیال ستا رہا تھا۔ اُنھوں نے اپنا شکاری چاقو نکالا اور ناگ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ وہ سوچ رہے تھے، اگر میرا وار خالی گیا تو ناگ مجھے ڈسنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ بائیں ہاتھ سے انھوں نے ایک شاخ کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ آخر اُنھوں نے اللہ کا نام لے کر چاقو کا وار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ دوسرے ہی لمحے بجلی کی سی تیزی سے اُن کا ہاتھ چلا۔ چاقو ناگ کے سر کا کچھ حصّہ زخمی کرتا ہوا گزر گیا۔ اس کے ساتھ ہی منوّر علی خاں نیچے جھک گئے۔ ناگ کا زخمی سر تیزی

سے چکّر کاٹنے لگا۔

اچانک منوّر علی خان کی سٹّی گم ہو گئی۔ ناگ نے زخمی ہوتے ہی اپنی دُم درخت کی شاخ سے آتار لی تھی اور اب اس کی دُم نے ان کے بائیں بازو کے گرد لپیٹنا شروع کر دیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ناگ کی یہ چال بہت خطرناک ہوتی ہے۔ ان کی کلائی کی ہڈی تک پچک سکتی تھی۔ تکلیف کے باعث ان کے منھ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی، اور چاقو ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا۔ ناگ کا پھن ابھی تک اسی تیزی سے لہرا رہا تھا اور بازو پر لپٹنے والے بلوں میں سختی آتی جا رہی تھی۔

آخر اُنھوں نے پھُرتی سے ناگ کا سر پکڑ لیا اور اُسے درخت کی شاخ پر رکھ کر رگڑنے لگے۔ اس کام میں اُنھوں نے پُورا زور صرف کر دیا، کیوں کہ بازو کی تکلیف ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ آخر ناگ کے بل کھُلنا شروع ہو گئے۔ اُنھوں نے ایک آخری رگڑا دیا اور سر کو بالکل کچل دیا۔ پھر ایک جھٹکے سے اسے دُور پھینک دیا۔ اُنھوں نے سوچا۔ یہ درخت خطرناک ہے اس لیے اس پر نہیں چڑھنا چاہیے، لیکن عین اسی وقت انھیں دُور کسی عمارت کا ایک سایہ سا دکھائی دیے

گیا۔ ان کا دِل بلّیوں اُچھلنے لگا۔ وہ تیزی سے نیچے اُترنے لگے۔ ابھی انھیں اپنا چاقو بھی تلاش کرنا تھا۔

رمضان نے کھانے کی ٹرے دروازے کے نیچے سے اندر کھسکا دی۔ اُنھوں نے دیکھا، ٹرے میں چنے کی دال اور موٹی موٹی روٹیاں تھیں۔ گویا یہ قیدیوں کا کھانا تھا۔ آصف اور فرحت نے اس کھانے کو دیکھ کر بُرا سا مُنھ بنایا، لیکن آفتاب نے بڑھ بڑھ کو ہاتھ مارنا شروع کر دیے۔ اس کی دیکھا دیکھی دونوں بھی کھانے لگے۔ کامران مرزا ان کا ساتھ دے رہے تھے۔ اِتنے میں رمضان نے پانی کے گلاس بھی اندر رکھ دیے۔

ابھی وہ گلاسوں کی طرف ہاتھ بھی بڑھانے نہیں پائے تھے کہ اُستاد چار آدمیوں کے ساتھ نمودار ہوا۔ اس کے چہرے پر غُصّے کے آثار تھے۔ وہ آتے ہی بولا:

"چلو اُٹھو! تُمھیں ہمارے ساتھ چلنا ہے۔"

"ہم پانی تو پی لیں۔" آفتاب نے کہا۔

"پانی پھر پی لینا۔" یہ کہہ کر اس نے جیل خانے کا دروازہ کھول دیا۔

وہ باہر نکل آئے۔ رمضان اُستاد کی شکل دیکھتے ہی

کِھسک گیا تھا۔ اُستاد کے ساتھیوں کے ہاتھوں میں گیس پستول تھے اور اُن کے تیور بھی بہت خطرناک تھے۔ آفتاب، آصف اور فرحت حیران تھے کہ آخر ہوا کیا ہے! پھر فرحت یہ سوچ کر دھک سے رہ گئی کہ کہیں اس کے ابّو تو نہیں پکڑ لیے گئے؟ اس خیال سے اُس کا دِل بیٹھنے لگا اس نے گھبرا کر کامران مرزا کی طرف دیکھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح اب بھی پُرسکون تھے اور آہستہ آہستہ قدم اُٹھا رہے تھے۔

جیل خانے سے نکل کر وہ برآمدے میں آئے اور ایک بار پھر برآمدے پر برآمدہ طے کرنے لگے۔ یہ عمارت چوکور بنائی گئی تھی۔ نہ جانے کتنے برآمدے تھے اور کتنے کمرے۔ مزے کی بات یہ کہ اس تہہ خانے کے اُوپر ایک کھنڈر نما عمارت تھی، جسے دیکھ کر کوئی خیال بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس کے نیچے اس قدر بڑا تہہ خانہ ہو گا۔

اُستاد ایک کمرے کے دروازے پر پہنچ کر رُک گیا۔ اس نے ایک نظر قیدیوں پر ڈالی اور پھر دروازے کی طرف مُڑ گیا۔ پُورے دروازے پر سیاہ رنگ کیا گیا تھا۔ انھیں دائیں طرف ایک بٹن نظر آیا۔ اس بٹن کے بالکل اُوپر سُرخ رنگ کا ایک تیر بنا ہوا تھا۔ دروازے پر دو مرتبہ دستک دی گئی۔

اندر سے آواز آئی:

"دروازہ کھلا ہے۔ چلے آؤ!"

وہ دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئے۔ کمرے میں بہت سی مشینیں لگی تھیں، اور سامنے آتش دان کے قریب ایک شخص بیٹھا تھا۔

"ان لوگوں کو لے آئے؟"

"جی ہاں مسٹر جارج۔" اس شخص نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا، جو سب سے آگے آیا تھا۔

"بہت خوب! اُستاد، تم ان لوگوں کو وہ چیزیں دکھا دو جو پیکٹ سے برآمد ہوئی ہیں۔" جارج نے کہا۔

اب اُنھوں نے چونک کر دوسری طرف دیکھا۔ اُستاد اور اس کے ساتھی بھیگی بلّی بنے کھڑے تھے۔ اُستاد کانپتا ہوا آگے بڑھا۔ اس نے میز پر سے ایک کپڑا ہٹا دیا۔ میز پر پڑی ہوئی چیزیں دیکھ کر آفتاب، آصف اور فرحت چونک اُٹھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کامران مرزا نقلی چیزیں پیکٹ میں باندھ کر لے آئیں گے۔

"کیا تم یہی چیزیں پروفیسر جیلانی کو دکھانے کا ارادہ رکھتے تھے؟" جارج نے اُن کی طرف مڑے بغیر کہا۔

"اوہ! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔" کامران مرزا نے بوکھلا

کر کہا۔ وہ ان چیزوں کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ جارج ایک دم اُن کی طرف مڑا اور گھورتے ہوئے بولا:

"کیوں؟ کیا بات ہے؟"

کامران مرزا نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ مسلسل آفتاب کو گھورے جا رہے تھے۔ آفتاب بُری طرح گھبرا گیا:

"کک .... کیا .... ہوا، ابّا جان؟"

"میں نے تم سے کہا تھا، ایسا نہ کرنا۔" اُنھوں نے تقریباً چلّا کر کہا۔

"کیا بات ہے؟ تم بچّے پر کیوں برس رہے ہو؟"

"جی کیا بتاؤں۔ میں تو گھر سے اصل چیزیں ہی لے کر چلا تھا۔ یہ سب کیا دھرا اس کا ہے۔" کامران مرزا نے آفتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ آفتاب پھٹی پھٹی آنکھوں سے کامران مرزا کو دیکھ رہا تھا۔

"کیا مطلب؟" جارج نے غرّا کر کہا۔

"بات در اصل یہ ہے کہ میرا یہ لڑکا کالا علم جانتا ہے۔"

"کالا علم! یہ کیا ہوتا ہے؟" جارج نے حیران ہو کر

کہا۔

"آپ نہیں جانتے۔ آپ کو اُردو بولتے سُن کر میں سمجھا تھا کہ آپ اِس مُلک میں پیدا ہوئے ہیں، لیکن معلوم ہوا کہ آپ اِس مُلک کے نہیں، کسی دُوسرے مُلک کے ہیں۔ خیر، کوئی بات نہیں۔ کالا علم در اصل ایک قِسم کا جادُو ہوتا ہے۔ لیکن شاید یہ آپ کے مُلک میں کسی کو نہیں آتا۔ ورنہ آپ بند پیکٹ دیکھ کر بھی بتا سکتے تھے کہ اِس میں اصلی چیزوں کے بجائے نقلی چیزیں ہیں۔"

"یہ کیا بکواس ہے!" جارج نے چِلّا کر کہا۔

"جی، بکواس نہیں۔ کالا علم۔" کامران مرزا نے کہا۔

"کِسی غلط فہمی میں نہ رہنا، کامران مرزا! میں یہاں بیٹھے بیٹھے تم سب کو اِس طرح صفحۂ ہستی سے مٹا سکتا ہوں کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ میں تمھارے اور ان بچّوں کے بارے میں سب کچھ سُن چُکا ہوں۔ اِس وقت تک جو حالات پیش آئے ہیں، ان سب سے باخبر ہوں۔ اگر یشوما ہمارے ہیڈ کوارٹر سے فرار ہونے میں کامیاب نہ ہو جاتا تو یہ بکھیڑا کبھی کھڑا نہ ہوتا، اور تم لوگوں کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ اُدھر یشوما فرار ہو کر تمھارے مُلک میں داخل ہوا، اِدھر ہمیں اس کے بارے میں اِطلاع دے دی گئی۔

اس کے پیچھے یہاں سے آدمی روانہ کیے گئے، جن کا لیڈر نمبر نو تھا۔ یشوما تمھارے گھر میں جا گھُسا۔ وہاں نمبر نو اور اس کے ساتھی گرفتار ہو گئے، لیکن ہمارے دُوسرے آدمیوں نے عین وقت پر اُنھیں چھُڑا لیا۔ نہ صرف انھیں چھُڑا لیا بلکہ تمھارے انسپکٹر خالد اور اُس کے ساتھیوں کو بھی یہاں لے آئے۔ صرف نمبر نو وہاں رہ گیا۔ اس کے ذمّے ڈیوٹی لگائی گئی تھی کہ یشوما کو کچھ بتانے سے پہلے ختم کر دے چُناں چہ وہ کامیاب رہا، لیکن بھاگنے میں کامیاب نہ ہو سکا اور تمھارے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کے بعد یہاں سے کچھ آدمیوں کو بھیجا گیا کہ یشوما کی لاش اور وہ چیزیں لے آئیں۔ وہ لوگ یشوما کی لاش لانے میں تو کامیاب ہو گئے لیکن دوبارہ ان چیزوں کو حاصل کرنے گئے تو گرفتار ہو گئے۔

اس کے بعد ہم نے اپنے اُن آدمیوں کو حوالات میں ہی ختم کرا دیا۔ اب تم سمجھ ہی سکتے ہو کہ اس وقت تم مکمّل طور پر ہمارے قبضے میں ہو۔ میں ذرا تمھیں نمونہ دکھا دوں کہ میں یہاں بیٹھے بیٹھے کیا کچھ کر سکتا ہوں۔ ٹھہرو! ایک جگہ دو باغی قید ہیں۔ میں پہلے تمھیں ان کی گفت گو سُناتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اُس نے ایک نیلے رنگ کا بٹن دبایا۔

بٹن کے دبتے ہی ان کے کانوں میں دو آدمیوں کے تیز تیز باتیں کرنے کی آواز آئی:

"میں نے کہا تھا نا، ہم دو آدمی کچھ بھی نہ کر سکیں گے جب تک ہم سب مل کر کوشش نہ کریں، کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہم یہیں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائیں گے۔ کوئی ہماری مدد کو نہیں آئے گا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ پتا نہیں کیوں میرے دماغ میں کیڑے کلبلائے تھے کہ ہم یہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اب قید کی زندگی بسر کرو۔ یوں تو یہ پوری دنیا ہی ایک قید خانہ ہے۔"

"ہاں، لیکن مشینوں پر کام کرنا اس کال کوٹھری سے تو بہتر تھا۔"

"معلوم ہوتا ہے، اب ہماری بقیہ زندگی یہیں گزرے گی۔"

"خدا جانے ...."

جارج نے بٹن دبا کر گفت گو کا یہ سلسلہ بند کر دیا پھر اُن کی طرف مڑتے ہوئے بولا "میں ہر گوشے میں ہونے والی گفت گو سن سکتا ہوں۔ اِسی طرح جس وقت بھی جسے چاہوں یہیں بیٹھے بیٹھے ختم کر سکتا ہوں۔ ٹھہرو! تمھیں ایک نمونہ

اس کا بھی دکھاتا ہوں۔ کمرے میں موجود آدمیوں کو گنو۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اُنھوں نے جلدی جلدی دیکھا۔ کمرے میں چار وہ خود تھے۔ اس کے علاوہ اُستاد اور اس کے پانچ ساتھی تھے۔ تین وہ تھے جو انھیں قید خانے سے لے کر آئے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا، کمرے میں جارج سمیت چودہ آدمی تھے۔

"اب سب ایک دوسرے کو نظر میں رکھیں۔" جارج نے کہا۔ اس کا یہ جملہ سن کر کمرے میں موجود جارج کے تمام آدمیوں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ وہ تھر تھر کانپنے لگے۔

اچانک جارج نے ایک سرخ رنگ کا بٹن دبایا۔ ایک کھٹکے کی آواز سنائی دی۔ ساتھ ہی ایک خوف ناک چیخ کمرے میں گونجی اور وہ شخص غائب ہو گیا جس کے منھ سے چیخ نکلی تھی۔

اُنھوں نے چونک کر دیکھا۔ ایک سیکنڈ کے لیے فرش کا ایک مربع ٹکڑا کسی صندوق کے ڈھکنے کی طرح نیچے گر گیا تھا اور اس ٹکڑے پر کھڑا ہوا اُستاد کا ایک ساتھی نیچے گر کر اُن کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے فرش برابر ہو چکا تھا۔

بلّیاں چیختی ہیں

درخت سے اُترنے کے بعد مُنوّر علی خاں اندازے کے مطابق اس سمت میں روانہ ہوئے۔ رات کی تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ انھیں یہ بھی فکر تھا کہ کہیں وہ لوگ مُصیبت میں نہ پھنس گئے ہوں اور ہر لمحے اُن کے اِنتظار میں ہوں۔ وہ جلد از جلد دُشمنوں کے ٹھکانے تک پہنچ کر اُن کی مدد کرنا چاہتے تھے، لیکن گھنے درختوں میں سے گزرنا بھی کچھ آسان کام نہ تھا۔ ابھی ابھی وہ ایک خوف ناک ناگ سے جنگ کر کے فارغ ہوئے تھے، اور اب بھی ہر قدم پر انھیں کسی جنگلی درندے اور زہریلے کیڑے کا دھڑکا لگا تھا۔ ان کے پاس ٹارچ بھی نہیں تھی کیوں کہ انھیں اس قدر لمبے سفر کی اُمّید نہ تھی۔ ان کا خیال تھا کہ شام ہونے تک وہ اس مُہم سے فارغ ہو جائیں گے۔

ایک بار ان کا قدم کسی ڈھلان پر پڑ گیا۔ ساتھ ہی ان کا سر جُھکی ہوئی ایک شاخ سے ٹکرایا۔ ان کو چکّر آ گیا۔

گرتے گرتے اُنھوں نے شاخ کو تھام لیا، لیکن پھر گھبرا کر شاخ پر سے ہاتھ ہٹا لیا۔ وہاں کوئی نرم نرم سی چیز موجود تھی۔ دُوسرے ہی لمحے اس چیز نے اُن پر چھلانگ لگائی۔ مُنوّر علی خاں پہلے ہی چکرائے ہوئے تھے، یہ نئی اُفتاد سر پر آ پڑی تو اور بھی بوکھلا گئے۔ اُنھوں نے اس کے پُوری قُوّت سے دو ہتّڑ مارا۔ وہ چِلّاتی ہوئی دُور جا گری۔

یہ ایک جنگلی بِلّی تھی۔ اس کا رنگ بالکل سیاہ تھا۔ اندھیری رات میں انھیں اُس کی شُعلوں کی مانند چمکتی ہوئی آنکھیں نظر آ گئیں۔ وہ ایک بار پھر چھلانگ لگانے کی تیّاری کر رہی تھی کہ وہ ہوشیار ہو گئے۔ جنگلی بِلّی کے پنجوں کے ناخن تیز دھار خنجر سے بھی خطرناک ہوتے ہیں۔ پھر جُوں ہی بِلّی نے ان پر چھلانگ لگائی، وہ جُھکائی دے کر ایک طرف ہٹ گئے۔ بِلّی اپنے ہی زور میں ایک درخت سے ٹکرائی۔ اس کے حلق سے ایک خوف ناک چیخ نکلی۔

چیخ کیا نکلی کہ بہت سی بِلّیاں چاروں طرف سے چِلّا چِلّا کر دوڑ پڑیں۔ مُنوّر علی خان کے ہوش اُڑ گئے۔ انھیں چاروں طرف بِلّیاں ہی بِلّیاں چھلانگیں لگا لگا کر جھپٹتی

نظر آئیں۔ اُنھوں نے کسی جنگل میں اتنی بڑی تعداد میں جنگلی بلّیاں نہیں دیکھی تھیں۔ انھیں اور تو کچھ نہ سوجھا، جلدی جلدی ایک درخت پر چڑھنے لگے۔ اِتنی دیر میں بلّیاں اس درخت کے نیچے پہنچ چکی تھیں۔ پہلے تو اُنھوں نے اُچھل اُچھل کر حملہ کیا، لیکن جب مُنوّر علی خاں ان کی پہنچ سے باہر نکل گئے تو اُنھوں نے درخت پر چڑھنا شروع کر دیا۔ اور اب حالت بالکل ایسی تھی جیسے مُنوّر علی خاں کسی قلعے کی فصیل پر چڑھے ہوئے ہوں اور حملہ آور سیڑھیاں لگا لگا کر فصیل پر چڑھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ وہ حیران تھے کہ یہ کس قسم کی بلّیاں ہیں جو سب کی سب مجھ پر ٹوٹ پڑی ہیں۔

اب ان کے لیے صرف ایک ہی چارہ رہ گیا تھا۔ اُنھوں نے فوراً ایک ہاتھ سے ایک شاخ تھامی اور چاقو نکال کر کھول لیا۔ اُنھوں نے ایک شاخ کو تھاما اور اپنی دونوں ٹانگیں بھی شاخ سے لپٹا لیں۔ پھر زور لگا کر چکّر کھایا اور اپنی کمر آسمان کی طرف اور مُنھ نیچے کی طرف کر لیا۔ دُوسرے ہی لمحے اُن کا چاقو والا ہاتھ ہوا میں لہرایا۔ بلّیاں اس مُصیبت سے بے خبر اُن کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ اچانک چاقو ایک بلّی کے پیٹ پر لگا۔ اس کے مُنھ سے

ایک بھیانک چیخ نکلی اور وہ دھب سے نیچے گر پڑی۔

مُنوّر علی خاں کی نظر نیچے پڑی۔ وہ سناٹے میں آ گئے۔ بیسیوں بلّیاں اُن پر یلغار کر رہی تھیں۔ ان کی زندگی میں اس سے زیادہ خوف ناک وقت کبھی نہیں آیا تھا۔ اُنھوں نے سوچا شاید یہ اُن کی زندگی کا آخری دن ہے۔ تاہم وہ بُزدلوں کی طرح خود کو موت کے مُنھ میں نہیں دے سکتے تھے۔ اُنھوں نے فیصلہ کر لیا کہ مرنا ہی ہے تو پھر کیوں نہ آخر دم تک ان کا مُقابلہ کیا جائے۔

یہ سوچتے ہی اُنھوں نے چاقو والا ہاتھ تیزی سے لہرانا شروع کر دیا۔ بلّیاں درخت کے تنے پر برابر چڑھ رہی تھیں، کٹ کٹ کر گر رہی تھیں۔ پھر بھی اُن کے جوش و خروش میں کوئی کمی نہیں آ رہی تھی۔ یُوں لگتا تھا جیسے وہ دیوانی ہو گئی ہوں۔

"یہ تُم نے کیا کیا؟ بلا وجہ ایک اِنسانی زندگی کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔" کامران مرزا ہوش و حواس میں آتے ہوئے بولے۔

"یہ میں نے تم کو نمونہ دکھایا ہے۔ ویسے بے فکر رہو۔ وہ شخص جو نیچے گرا ہے، ابھی مرا نہیں۔ ہاں اگر اسے

چند روز تک وہاں سے نکالا نہ جائے تو ضرور مر جائے گا۔ میں تمھیں بھی یہیں بیٹھے بیٹھے اس کے پاس پہنچا سکتا ہوں۔ کیا خیال ہے، جانا پسند کرو گے؟" جارج نے کہا۔

کامران مرزا کچھ نہ بولے۔ دانت پیس کر رہ گئے۔ وہ پھر بولا "میں یہاں موجود تمام لوگوں کو منٹوں میں ختم نہیں کر سکتا ہوں۔ لیکن میرا بال بھی بیکا نہیں ہو سکتا۔ فرض کرو، تم میں سے کوئی مجھ پر حملہ کرنے کا خیال دل میں لائے۔ جوں ہی اس کا قدم میری طرف بڑھے گا، میں ایک بٹن دباؤں گا، اور وہ نیچے جا گرے گا۔ گیس کے پستولوں کا اثر تو میرے ان آدمیوں پر بھی نہیں ہوتا تو مجھ پر کیا ہوگا۔ رہے دوسرے ہتھیار، تو ان سے وار کرنے سے پہلے وہ نیچے جا گرے گا۔ یہاں سے باہر نکلنے کا راستہ میرے سوا اور کسی کو نہیں معلوم۔ استاد کو بھی صرف اندر آنے کا راستہ معلوم ہے۔ اور مزے کی بات بتاؤں، اس پوری دنیا کو صرف ایک سیکنڈ میں وہ .... جو ہم سے سینکڑوں میل دور بیٹھا ہے، ختم کر سکتا ہے۔ مجھ سمیت۔ میں بھی اس کے آگے دم نہیں مار سکتا۔ وہ وہیں بیٹھے بیٹھے جب چاہے، اس پوری جگہ کو ملبے کے ڈھیر میں تبدیل کر سکتا ہے۔ لہٰذا تم خود سوچو کہ تم کہاں آ پھنسے ہو۔ اب تمھارے

لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ تم بھی اسی دنیا کے کے لیے کام کرو۔ جب تک تم کام کرنے پر آمادہ نہیں ہو جاتے، تمھیں قید خانے میں رکھا جائے گا۔"

"آخر تم لوگ چاہتے کیا ہو؟" کامران مرزا نے کہا۔

"ہم کیا چاہتے ہیں؟ شاید تمھیں میری بات پر یقین نہ آئے۔ اس بات کا علم سوائے اس کے اور کسی کو نہیں۔ اسی کو، جس کا میں نے ابھی ذکر کیا تھا۔" جارج نے کہا۔

"وہ کون ہے؟"

"یہ کوئی نہیں جانتا۔ آج تک اسے کسی نے نہیں دیکھا۔ جس طرح میں یہاں بیٹھ کر سارا کام چلاتا ہوں، وہ وہاں سے سب کو کنٹرول کرتا ہے۔ وہ جگہ اس جگہ سے ہزاروں گنا خوف ناک اور خطرناک ہے۔"

"اور وہ جگہ کہاں ہے؟" کامران مرزا نے پوچھا۔

"افسوس! میں نہیں جانتا۔ البتہ یشوما ضرور جانتا تھا۔ صرف یشوما۔ یا پھر وہ جانتا ہے۔"

"اس کا نام کیا ہے؟"

"وہ۔ اس کا نام "وہ" ہے۔" جارج نے پُراسرار لہجے میں کہا۔

"بہت خوب! تب تم ہمیں واپس قید خانے میں بھیج دو۔ ہم سوچیں گے کہ کام کرنا چاہیے یا قید خانے ہی میں دن گزارنے چاہئیں۔"

"اچھی بات ہے۔ خوب سوچ لو۔ لیکن یاد رکھو! یہاں تمھاری ایک نہ چلے گی۔ ہر چال ناکام ہو جائے گی۔ اور تم بے موت مر جاؤ گے۔"

"نہیں۔ ہم کوئی چال چلنے کے بارے میں نہیں سوچیں گے۔ صرف یہ سوچیں گے کہ یہاں رہ کر کام کریں یا قید خانے میں رہ کر مفت کی روٹیاں توڑیں۔"

"کل صبح تمھیں میرے آدمی یہاں کی سیر کرا دیں گے جس سے تمھیں اندازہ ہو جائے گا کہ یہاں کیا کیا کام لیا جاتا ہے۔"

"بہت خوب! ہم ضرور اس سیر سے لطف اٹھائیں گے۔" آفتاب نے پہلی بار خوش ہو کر کہا۔ جارج نے چونک کر اسے دیکھا، پھر کامران مرزا سے بولا "یہ تمھارا لڑکا ہے؟"

"ہاں۔ یہی ہے وہ جس نے تمھارے آدمیوں کا منصوبہ خاک میں ملا دیا۔" کامران مرزا نے کہا۔

"لیکن ہم یشوما کی لاش حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔"

"پھر بھی وہ چیزیں ابھی تک حاصل نہیں کر سکے۔

یشوما کی لاش تو ہمارے لیے بے کار تھی۔" کامران مرزا بولے۔

"اس بات کو تم نہیں سمجھ سکتے کہ اس کی لاش بے کار تھی یا کار آمد۔ اس بات کو تو میں بھی نہیں جانتا۔ ہاں، وہ ضرور جانتا ہے۔ اسی نے حکم دیا تھا کہ یشوما کی لاش کو ہر حال میں اٹھوا لیا جائے۔"

"اور ان چیزوں کے متعلق اس نے کیا کہا تھا؟" کامران مرزا مسکرائے۔

"اس نے ان چیزوں کو حاصل کرنے کا بھی حکم دیا تھا۔"

"تو کیا اسے یہ معلوم نہیں ہوا کہ تم لوگ ان چیزوں کو پانے میں کس بری طرح ناکام ہوئے ہو؟" کامران مرزا نے پوچھا۔

"ہاں، وہ ہم سے ہر روز رپورٹ طلب کرتا ہے۔ اسے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ آج بھی اسے رپورٹ دینی ہو گی۔ مگر تمھیں ان باتوں سے کیا مطلب؟" یہ کہہ کر وہ اپنے آدمیوں کی طرف مڑا "انھیں واپس قید خانے میں لے جاؤ اور کڑی نگرانی کرو۔ رمضان کو وہاں سے ہٹا دو۔ وہ ان لوگوں سے واقف ہے۔ کل صبح انھیں ہر جگہ کی سیر کرائی جائے

گی۔ اس کے بعد.....‘‘

اس کے الفاظ مُنھ میں ہی رہ گئے۔ لاؤڈ سپیکر کی شکل کے ایک آلے میں سے بھنبھناہٹ کی سی آواز اُبھرنے لگی تھی۔ جارج نے جلدی سے ایک بٹن گھمایا۔ آواز بلند ہو گئی۔

یہ بیسیوں بلّیوں کے ایک ساتھ چیخنے چلّانے کی آواز تھی۔

مُنوّر علی خاں کو یہ جنگ ختم ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ بلّیوں کی تعداد میں ابھی تک کوئی کمی نہیں ہوئی تھی۔ اگرچہ اس وقت تک وہ دس بارہ بلّیوں کو موت کے گھاٹ اُتار چکے تھے، اور اس سے کہیں زیادہ تعداد کو زخمی کر چکے تھے، لیکن اس پر بھی بلّیوں کے جوش و خروش میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔

اس وقت تک اگر بلّیوں کے حملے میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی تو مُنوّر علی خاں بھی سُست نہیں پڑے تھے۔ ان کی زندگی میں بھی ہزاروں بار جان لیوا مواقع آئے تھے اور انھوں نے ہمّت کا دامن اپنے ہاتھ سے نہ چھوڑا تھا۔ لیکن اس وقت حالات کچھ مختلف تھے۔ انھیں اپنے

سے زیادہ فکر کامران مرزا اور بچّوں کی تھی۔

انھیں رہ رہ کر یہ خیال ستا رہا تھا کہ کامران مرزا اور بچّے ان کی مدد کا بے چینی سے اِنتظار کر رہے ہوں گے، لیکن وہ مجبور تھے۔ وہ فوراً ان تک پہنچنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ اس وقت اُنھوں نے محسوس کیا کہ انسان کس قدر بے بس ہے۔

اُنھوں نے خُدا کو یاد کیا۔ اسے مدد کے لیے پُکارا اور پھر پُوری شدّت سے ہاتھ پیر چلانے لگے —— ساتھ ہی بلّیوں سے کسی طرح بچ نکلنے کا کوئی راستہ بھی تلاش کر رہے تھے۔ اچانک اللہ تعالیٰ نے اُن کی مدد فرمائی، اور ان کے ذہن میں یہ بات ڈالی کہ ان کے پاس چاقو کے علاوہ دستی بم بھی تو موجود ہیں۔ اس خیال کا آنا تھا کہ اُنھوں نے بلّیوں پر بم پھینکنے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ بم نکالنا ناممکن تھا۔ ان کے دونوں پیر اور دایاں ہاتھ تو بلّیوں سے جنگ میں مصروف تھے اور بائیں ہاتھ سے شاخ کو پکڑ رکھا تھا۔ اگر وہ اس ہاتھ سے شاخ کو نہ تھامے ہوتے تو توازن کھو بیٹھتے اور نیچے گر کر بلّیوں کا تر نوالہ بن چکے ہوتے۔

لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ بائیں ہاتھ کو شاخ

پر سے ہٹائیں اور جس قدر جلد ممکن ہو سکے، اس ہاتھ سے بم نکالیں۔ یہ ایک خطرناک حرکت تھی، لیکن وہ یہ خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہو گئے۔

اُنھوں نے بایاں ہاتھ اس تھیلے میں ڈال دیا جس میں دستی بم اور دُوسری چیزیں تھیں اور جو اُن کی کمر کے ساتھ بندھا تھا۔ دُوسرے ہی لمحے وہ شاخ سے اُکھڑ گئے اور بائیں طرف گرتے چلے گئے۔ ایسے میں اُن کا حوصلہ کام آیا اُنھوں نے اپنی دونوں ٹانگوں کو آپس میں اُلجھا لیا۔ اب حالت یہ تھی کہ ان کے پیر شاخ سے چمٹے ہوئے تھے اور سر شاخ سے نیچے لٹک رہا تھا۔ دونوں ہاتھ بھی نیچے جھول رہے تھے۔ اُنھیں یُوں لگا، جیسے وہ کسی آن بھی گرنے والے ہیں۔ چاقُو والا ہاتھ تیزی سے چلاتے ہوئے انھوں نے دانتوں سے بم کی سیفٹی پن نکالی اور بم ذرا فاصلے پر دے مارا۔

"ارے! ہماری پالتُو آدم خور بلّیوں کو کیا ہوا؟" جارج نے حیرت زدہ لہجے میں کہا "کہیں اُنھوں نے کوئی شکار تو نہیں پھانس لیا؟" پھر اس نے چونک کر کامران مرزا کی طرف دیکھا "کیا تمھارے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟"

"میرے ساتھ جو تھے، وہ یہاں کھڑے ہیں۔"

"معلوم ہوتا ہے، کوئی تمھارے پیچھے بھی تھا جو جنگل میں پہنچ چکا ہے۔" جارج نے کہا۔

کامران مرزا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سوچ میں پڑ گئے کہ کہیں منوّر علی کسی مصیبت میں تو نہیں پھنس گئے۔ ویسے وہ آدم خور بلّیوں کا ذکر سُن کر ششدر رہ گئے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ کیا بلّیاں بھی آدم خور ہو سکتی ہیں!

"اگر تمھارا کوئی ساتھی تمھارے پیچھے آرہا تھا تو ہمیں فوراً اس کے متعلق بتا دو۔ اس وقت تو ہم اس کی جان بچا سکتے ہیں، لیکن چند لمحوں بعد بلّیاں اس کے جسم کی ہڈّیوں کے سوا کچھ نہ چھوڑیں گی۔ میں چاہوں تو یہیں بیٹھے بیٹھے بلّیوں کو روک سکتا ہوں۔"

"میں یہ بات اچھّی طرح جان گیا ہوں کہ تم ہر کام یہیں بیٹھے بیٹھے کر سکتے ہو۔" کامران مرزا نے بُرا سا منھ بنا کر کہا۔ اس پر آصف، آفتاب اور فرحت مُسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ کامران مرزا کہہ رہے تھے "پھر بھی میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ میں اپنے پیچھے کسی کو نہیں لایا۔ جو آئے ہیں، میرے ساتھ ہی آئے ہیں۔"

"تب پھر یہ کون ہے، جس پر بلّیاں جھپٹ رہی ہیں؟"

جارج نے اس آلے کی طرف اِشارہ کر کے کہا جس میں سے چیخ و پکار کی دِل ہلا دینے والی آوازیں آ رہی تھیں۔

"مجھے کیا معلوم، یہ کون ہے؟" اُنھوں نے کہا۔

"بہت خوب! تو پھر یہ جان لو کہ اس کو ختم ہونے میں صرف چند منٹ لگیں گے۔"

"مجھے اس سے کیا غرض کہ وہ کتنے منٹ میں ختم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جنگل میں بِلّیوں کا اِنتظام میں نے نہیں، تم نے کر رکھا ہے۔" کامران مرزا نے مُسکرا کر کہا۔ وہ جانتے تھے کہ مُنوّر علی خاں کوئی تر نوالہ نہیں ہیں۔ وہ ان بِلّیوں کی خوراک آسانی سے نہیں بنیں گے۔

"ہاں۔ یہ بِلّیاں ہم نے اِسی لیے پال رکھی ہیں کہ کوئی بھُولا بھٹکا اس طرف آ نکلے تو یہ اُسے سنبھال لیں۔ یہ ایک جزیرے سے لائی گئی ہیں اور انسانی گوشت بڑے شوق سے کھاتی ہیں۔"

"لیکن تم لوگ ان سے کیسے بچ جاتے ہو؟" آفتاب نے حیران ہو کر کہا۔

"ہم لوگ ایک خاص راستے سے آتے ہیں۔ بِلّیاں اس راستے پر نہیں آ سکتیں۔ یُوں بھی وہ ہمیں اچھی طرح پہچانتی ہیں۔ یہاں صرف چند بِلّیاں لا کر چھوڑی گئی تھیں۔ لیکن

ایک ہی سال میں ان کی تعداد میں کئی سو کا اضافہ ہو گیا۔"

ان پر کپکپی طاری ہو گئی۔ وہ سمجھ گئے کہ مُنوّر علی بِلّیوں کے گھیرے میں پھنس گئے ہیں۔ آلے میں شور ہر لمحے بڑھتا جا رہا تھا۔ کچھ دیر کے لیے سب خاموشی سے ان آوازوں کو سُنتے رہے۔

"کمال ہے! ابھی تک کسی انسان کے چیخنے چِلّانے کی آواز نہیں سُنائی دی۔" جارج نے کہا۔

"ہو سکتا ہے، اس بے چارے کو چِلّانے کی مُہلت بھی نہ ملی ہو۔" اُستاد نے ہنس کر کہا۔

"ہاں، یہ بھی مُمکن ہے۔ در اصل بِلّیاں یکایک حملہ کر دیتی ہیں، اور پھر اُن کے ناخن خنجر سے زیادہ تیز اور نوکیلے ہیں۔"

"ان سے کسی کا بچنا ناممکن ہے۔ ہڈیوں پر ایک رتّی گوشت نہیں رہنے دیتیں۔" اُستاد نے پھر ہاں میں ہاں ملائی۔

کامران مرزا کے کان آلے کی طرف لگے تھے اور اس میں سے آنے والی آوازوں کو بغور سُن رہے تھے۔ آفتاب، آصف اور فرحت اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔ یہ لمحے اُن

کے لیے بہت تکلیف دہ تھے۔ انھیں یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی اُن کے دِلوں کو مٹھی میں پکڑ کر پُورے زور سے بھینچے ڈال رہا ہو۔ ان کا جی چاہ رہا تھا کہ یہاں سے بھاگ نکلیں اور منوّر علی خاں کی مدد کو پہنچ جائیں۔

اچانک سب کے کان کھڑے ہو گئے۔ آلے میں سے آنے والے شور میں اب بہت اضافہ ہو گیا تھا۔ شاید بلّیوں کے حملے میں تیزی آگئی تھی۔ اِسی وقت جارج نے مُسکرا کر کہا:

"معلوم ہوتا ہے، بلّیوں نے اپنے شکار پر قابو پالیا ہے، اور وہ اسے زمین پر گرا چکی ہیں۔ اس قسم کی آوازیں اسی وقت سُننے میں آتی ہیں۔ جب وہ اپنے شکار کو گرا لیتی ہیں۔ لیکن تم لوگوں کے چہرے کیوں تاریک ہو گئے ہیں؟ اس وقت جو شخص بلّیوں کے نرغے میں ہے، وہ تمھارا ساتھی تو نہیں ہے۔ پھر کیوں تمھارے چہروں پر اڑھائی بج رہے ہیں؟"

ان کے مُنھ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ اچانک ہال میں موجود تمام آدمی بُری طرح چونکے۔ ایک زبردست دھماکے کی آواز آئی تھی پُورا ہال گونج کر رہ گیا اور بلّیوں کی آواز دبتی چلی گئی۔

چند لمحوں کے لیے وہ سکتے میں رہ گئے۔ پھر جارج نے گھبرا کر کہا "یہ تو کسی بم کا دھماکا تھا۔ کہیں بلّیوں کے شکار نے اُن پر بم تو نہیں دے مارا۔ بلّیوں کی دبتی ہوئی آوازیں میرے اس خیال کی تائید کر رہی ہیں"

اس کا چہرہ غُصّے سے سُرخ ہو گیا۔ پھر فوراً ہی اس نے ایک بٹن دبایا اور مائک کی شکل کے آلے میں چیخ چیخ کر کہنے لگا:

"خبردار! فوراً جنگل میں پھیل جاؤ۔ کوئی شخص بلّیوں کی زد سے بچ نکلا ہے۔ دیکھو! وہ بچ کر جانے نہ پائے۔ میں دروازہ کھول رہا ہوں"

پُراَسرار آواز

آدھی سے زیادہ بلّیاں ڈھیر ہو گئی تھیں۔ باقی جو بچیں، وہ چیختی چلّاتی بھاگ نکلیں۔ مُنوّر علی خاں خود بھی بم کی زد سے مشکل سے بچے تھے۔ اگر وہ فوراً ہی اپنے آپ کو شاخ کے بالکل ساتھ نہ چمٹا لیتے تو بم کے ٹکڑے اُن کے جسم کو چھید گئے ہوتے۔ وہ تیزی سے درخت سے اُترے اور یہ سوچ کر تیز تیز قدم اُٹھانے لگے کہ انھیں پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔ خُدا جانے کامران مرزا اور بچّوں پر کیا بیت رہی ہو گی۔

اگرچہ وہ پہلے کی نسبت تیز چل رہے تھے لیکن بہت احتیاط کر رہے تھے۔ وہ جان چکے تھے کہ یہ خوف ناک جنگل قدم بہ قدم خطروں سے پٹا پڑا ہے۔ اب اُن کے دائیں ہاتھ میں ریوالور اور بائیں میں شکاری چاقُو تھا۔ وہ چاہتے تھے، جلد از جلد اُن تک پہنچ جائیں۔ اس سے پہلے وہ کسی اور جھنجھٹ میں پھنسنا نہیں چاہتے تھے۔

انھیں کیا معلوم تھا کہ ابھی ان کے راستے میں کچھ اور بھی مشکلات ہیں۔ اچانک وہ ٹھٹک کر رُک گئے۔ انھوں نے دوڑتے قدموں کی آواز سُنی تھی۔ یہ آواز لمحہ بہ لمحہ نزدیک ہوتی جا رہی تھی۔ اُنھوں نے چاروں طرف دیکھا۔ وہ ایک بار پھر خطرے میں تھے۔ اچانک اُن کی نگاہ ایک بہت اُونچے درخت پر پڑی۔ انھیں اور تو کچھ نہ سُوجھا، ریوالور کو پیٹی میں رکھا، چاقو کو دانتوں سے پکڑا اور درخت پر چڑھنے لگے۔ ابھی اُنھوں نے خود کو شاخوں کے درمیان چھُپایا بھی نہیں تھا کہ تین چار فائر ایک ساتھ ہوئے۔ پھر جنگل میں ایک آواز گُونجی:

"خبردار! ہم نے تمھیں دیکھ لیا ہے۔ اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ دونوں ہاتھ سر سے اُوپر اُٹھا کر دس قدم آگے بڑھو، ورنہ چھلنی کر دیے جاؤ گے۔"

مُنوّر علی خاں نے ان الفاظ کو غور سے سُنا۔ پھر وہ مسکرانے لگے۔ ان کے گرد گھیرا ڈالنے والوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں ہیں۔ اُنھوں نے چال چلی تھی، لیکن وہ ان کی چال کو سمجھ گئے اور چُپ چاپ درخت کی ایک شاخ سے لگ کر بیٹھ گئے۔

"تم نے ہماری ہدایت پر عمل نہیں کیا۔ اب ہم تین تک گنیں گے۔ اس کے بعد گولیوں کی بوچھاڑ کر دی جائے گی" آواز آئی۔

مُنوّر علی خاں دم سادھے بیٹھے رہے۔ فوراً چاروں طرف سے گولیوں کی باڑھ ماری گئی۔ یہ فائر اندھا دُھند کئے گئے تھے، اس لیے اِدھر اُدھر نکل گئے۔ وہ بے ساختہ مُسکرا اُٹھے۔ اُن کا خیال بالکل صحیح تھا۔ دُشمنوں نے ابھی تک ان کو نہیں دیکھا تھا۔

وہ فائر کرنے کے بعد رُک گئے۔ شاید وہ اِنتظار کرنے لگے تھے کہ اُن کی طرف سے کوئی کارروائی ہو۔ آخر اُنھوں نے ایک بار پھر گولیاں چلائیں۔ پھر ایک آواز سُنائی دی:

"معلوم ہوتا ہے، وہ جو کوئی ہے، نہتّا ہے۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے" کسی نے جواب میں کہا۔

"کیوں؟ ہو کیوں نہیں سکتا؟ بلّیوں سے لڑتے ہوئے ہو سکتا ہے اس کا پستول وغیرہ جنگل میں گر گیا ہو۔"

"ہاں۔ یہ ممکن ہے۔" ایک آواز آئی۔

"دائرے کی شکل میں آگے بڑھو، اور اُسے ہر جگہ تلاش کرو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی درخت پر چھپا

بیٹھا ہو، اس لیے درختوں پر نظر ڈالتے ہوئے چلو، اور جہاں بھی وہ نظر آئے فوراً ختم کر دو۔"

آواز آنی بند ہو گئی۔ ابھی تک یہ لوگ مُنوّر علی خاں کو نظر نہیں آئے تھے۔ شاید وہ جھاڑیوں میں چھُپتے ہوئے بڑھ رہے تھے۔ وہ چاروں طرف دیکھنے لگے۔ کچھ تو رات کی تاریکی، کچھ گھنا جنگل۔ ایسے میں جھاڑیوں کی اوٹ لے کر آگے بڑھتے ہوئے دُشمنوں کو دیکھ لینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اگر آسمان پر تارے نہ کھِلے ہوتے تو پھر تو یہ بالکل ہی ناممکن ہو جاتا۔

ان کا دِل دھک دھک کر رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ بُزدِل تھے۔ وجہ صرف یہ تھی کہ انھیں کامران مرزا تک پہنچنے کی جلدی تھی، لیکن اس وقت تک اُن کے راستے میں رکاوٹیں ہی رکاوٹیں پیش آتی رہی تھیں۔ اب تو وہ یہ سوچ رہے تھے کہ وہ کامران مرزا تک پہنچ بھی سکیں گے یا نہیں۔

جھاڑیوں میں سرسراہٹ کی آواز اب انھیں سُنائی دینے لگی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ دُشمنوں کا گھیرا تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ اب انھیں اپنے بچاؤ کے لیے کچھ کرنا تھا۔ فائر وہ کر نہیں سکتے تھے۔ اُنھوں نے ریوالور کو تو

جیب میں رکھ لیا اور چاقُو کو دائیں ہاتھ میں پکڑ لیا۔ بائیں ہاتھ سے اُنھوں نے جیب سے رسّی نکالی اور اس کا پھندا بنانے لگے۔ اس قسم کے پھندوں سے اُنھوں نے بہت سے جانور شکار کیے تھے۔

وہ چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ اچانک ایک نزدیکی جھاڑی میں سرسراہٹ ہوئی۔ وہ چونک کر اُدھر دیکھنے لگے۔ اس جھاڑی کے آس پاس کی جھاڑیوں میں بھی حرکت ہونے لگی تھی۔ وہ سمجھ گئے کہ دائرے کی ایک سائڈ ان کی طرف بڑھ رہی ہے۔ دُشمنوں نے دائرے کا مرکز بلّیوں کے رہنے کی جگہ کو بنایا تھا۔ پھر اُنھوں نے دیکھا، چار آدمی گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل چلتے ہوئے نیم دائرے کی شکل میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک کا رُخ بالکل اُن کے درخت کی سیدھ میں تھا۔ وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ پھندا اُنھوں نے نیچے لٹکا کر، درخت کے تنے کے ساتھ لگا لیا۔

تین دُشمن ان کے درخت سے کچھ فاصلے پر رینگتے ہوئے آگے گزر گئے۔ چوتھا دشمن لمحہ بہ لمحہ اُن کے درخت کے پاس پہنچ رہا تھا۔

وہ بُت بنے کھڑے تھے۔ یہ مُہم اُن کی اُمید کے

خلاف لمحہ بہ لمحہ خطرناک ہوتی جا رہی تھی۔ مُنوّر علی خاں کو پکڑنے کے لیے لوگ بھیج دیے گئے تھے، اور وہ کمرے میں یوں کھڑے تھے جیسے اُنھیں جادُو کے ذریعے پتھّر کا بنا دیا گیا ہو۔ اچانک جارج نے مُسکرا کر کہا:

"تم لوگ سکتے میں کیوں آ گئے؟"

"ہم اس لیے سکتے میں آ گئے ہیں کہ تم ہر کام یہیں بیٹھے بیٹھے کر لیتے ہو، لیکن ایک شخص کو پکڑنے کے لیے اپنے آدمیوں کی خدمات لینے پر مجبور ہو۔ کیا تم کوئی ایسا طریقہ نہیں اختیار کر سکتے تھے کہ کسی باہر سے آنے والے دُشمن کو بھی یہیں بیٹھے بیٹھے پکڑ لو؟" آفتاب نے کہا۔

"خاموش! تم بہت بدتمیز ہو۔"

"یہ میرے لیے بالکل نئی اِطّلاع ہے۔ آج سے پہلے یہ بات مجھے کسی نے نہیں بتائی۔"

"تمھاری زبان ہے یا کیا؟ ہر وقت ٹرٹر کرتی رہتی ہے۔" جارج نے غرّا کر کہا۔

آصف اور فرحت مُسکرانے لگے۔ آفتاب نے کمرے کی موت کی سی خاموشی کو دُور کر دیا تھا۔ اُستاد اور اس کے ساتھی اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔

ایک بار گی اُنھوں نے آلے میں سے کسی کو کہتے سُنا:

"خبردار! ہم نے تمھیں دیکھ لیا ہے۔ اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ اپنے دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھا کر دس قدم آگے بڑھو، ورنہ چھلنی کر دیے جاؤ گے۔"

"لو! تمھارا ساتھی پکڑا گیا۔" جارج نے ہنس کر کہا۔ "ابھی اسے یہاں پیش کیا جائے گا۔ وہ تمھارے سامنے یہ اقرار کرے گا کہ وہ تمھارا ساتھی ہے۔"

"لیکن تم تو ہمیں قید خانے بھیج رہے تھے۔" کامران مرزا نے اسے یاد دلایا۔

"اب اس وقت تک یہیں رکو، جب تک وہ اسے پکڑ کر نہیں لے آتے۔"

"لیکن ہم کھڑے کھڑے تھک گئے ہیں۔" آفتاب نے پیر پٹخ کر کہا۔

"ہمارے لیے کُرسیوں کا بندوبست کرو۔" فرحت نے کہا۔

"ورنہ ہم گر جائیں گے۔" آفتاب بولا۔

"تم دیکھ رہے ہو، اس کمرے میں کتنی کرسیاں موجود ہیں۔ لیکن ان پر بیٹھنے کی جرأت کسی میں نہیں۔ ان پر تو صرف وہ لوگ بٹھائے جاتے ہیں، جو کوئی غلطی کر بیٹھتے ہیں۔ یہ کُرسیاں سزا دینے کے لیے ہیں....." جارج

کہتے کہتے رُک گیا۔ آلے میں سے پھر آواز آئی تھی:

"تم نے ہماری ہدایت پر عمل نہیں کیا۔ اب ہم تین تک گنیں گے۔ اس کے بعد تم پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی جائے گی۔"

کامران مرزا کے چہرے پر مُسکراہٹ پھیل گئی۔ جارج کا چہرہ تن گیا۔ آخر اس نے کہا:

"فکر نہ کرو۔ وہ بچ نہیں سکتا۔ ہاں، تو میں کہہ رہا تھا کہ اگر تم زیادہ ہی تھک گئے ہو تو بڑے شوق سے کرسیوں پر بیٹھ سکتے ہو۔ لیکن یاد رکھو! یہ کُرسیاں بیٹھنے والوں کو اس وقت اُٹھنے نہیں دیتیں جب تک کہ میں نہ چاہوں۔"

"اپنے کسی آدمی کو بٹھا کر دکھاؤ تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ یہ کُرسیاں کس قسم کی ہیں۔" آفتاب نے کہا۔

"تم پھر بولے۔ شاید تمھیں کُرسی پر بٹھانا ہی پڑے گا۔" جارج نے کہا۔

"یہ کُرسیاں بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ جب ہم جائیں گے تو انھیں ساتھ لے جائیں گے۔" فرحت نے خوش ہو کر کہا۔

"واہ! بہت اچھا خیال ہے۔" آصف نے کہا۔

"لیکن ہم جانے سے پہلے ایک کام ضرور کریں گے۔"

آفتاب نے کہا۔ اس کے جملے پر سب نے چونک کر اُسے دیکھا۔

"تم نے بتایا نہیں، کیا کام کرو گے؟" آصف نے پوچھا۔

"ہم جانے سے پہلے ان لوگوں کو ان کرسیوں پر بٹھا کر ضرور دیکھیں گے" آفتاب نے مسکرا کر کہا۔ اس پر کامران مرزا بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

یوں وہ سب اندر ہی اندر سہمے ہوئے تھے۔ ان کا دھیان اس آلے کی طرف لگا تھا جس میں سے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد دو مرتبہ گولیاں چلنے کی آواز آئی تھی۔ اس کے بعد کوئی آواز سنائی نہیں دی تھی۔

"تمھاری یہ شوخی اور طرّاری بس تھوڑی دیر کی ہے۔ اس کے بعد تم زندگی کے باقی دنوں میں کبھی نہ ہنس سکو گے۔ تمھیں یہاں غلاموں کی طرح کام کرنا ہوگا۔ باہر کی دُنیا والے تمھاری تلاش میں سر پٹک کر مر جائیں گے۔"

"یہ سب تو خیر وقت بتائے گا۔ تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ تم لوگ چاہتے کیا ہو؟" کامران مرزا نے کہا۔

"میں تمھیں بتا چکا ہوں۔ یہ کسی کو نہیں معلوم کہ

ہماری اس جماعت کا کیا مقصد ہے۔ ہم تو صرف اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں۔ وہ کیا چاہتا ہے؟ یہ صرف وہی جانتا ہے۔"

"تب پھر ایک دن تم کو بھی سر پکڑ کر رونا پڑے گا، کیوں کہ وہ کسی کا بھی نہیں ہو سکتا۔ اس کے اِرادے کس قدر خوف ناک ہیں، اس کا اندازہ صرف میں ہی لگا سکتا ہوں۔ یشوبا کے الفاظ ہر وقت میرے کانوں میں گونجتے رہتے ہیں۔"

"ہم اس کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سن سکتے۔ ہماری جان اس کی مٹھی میں ہے۔ وہ جس وقت چاہے، ہم کو ملیا میٹ کر سکتا ہے۔"

"ہاں۔ جس طرح تم یہاں بیٹھے بیٹھے سب کو ملیا میٹ کر سکتے ہو" کامران مرزا نے کہا "لیکن یہ تو بتاؤ، اس کا حکم مان کر تمھیں کیا ملتا ہے؟"

"ہم تمھیں کوئی بات بتانے کے پابند نہیں ہیں۔ تاہم اتنا ضرور سن لو کہ ہمیں دُنیا کا ہر عیش و آرام میسّر ہے، جو جی چاہتا ہے، حاصل کر لیتے ہیں۔"

"لیکن ایک دن ....." کامران مرزا کے الفاظ درمیان میں ہی رہ گئے۔

کمرے میں اچانک سُرخ روشنی پھیل گئی تھی۔ یہ روشنی کبھی جل رہی تھی اور کبھی بجھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک پُراَسرار سی آواز بھی کمرے میں گونجنے لگی تھی۔

اس روشنی اور پُراَسرار آواز کے ساتھ ہی جارج کا رنگ اُڑ گیا۔ اُس نے فوراً جنگل سے آنے والی آواز کے آلے کو بند کر دیا۔ اُستاد اور اس کے ساتھ کھڑے دُوسرے آدمیوں کا بھی خوف کے مارے بُرا حال ہو گیا۔ کامران مرزا نے دیکھا، وہ تھر تھر کانپ رہے تھے۔ جارج ایک چھوٹی سی مشین پر جُھک گیا تھا۔ اس مشین میں سے مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی آواز آنے لگی تھی۔ اچانک بھنبھناہٹ رُک گئی اور ایک صاف آواز سُنائی دی۔ کوئی شخص انگریزی میں کہہ رہا تھا:

"کیا وہ چیزیں مل گئیں؟"

"جی، ابھی تک نہیں ملیں۔ البتّہ ہم نے ان لوگوں کو پکڑ لیا ہے جن کے پاس وہ چیزیں ہیں۔ اب وہ ہمارے قبضے میں ہیں۔" جارج نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ان کی وجہ سے کافی پریشانی اُٹھانا پڑی ہے۔ ان لوگوں کو ہرگز نہ چھوڑا جائے، اور اِن سے یہ اُگلوایا جائے کہ اُنھوں نے وہ چیزیں کہاں چھُپائی ہیں۔ پھر

اس جگہ سے وہ برآمد کی جائیں اور پھر مجھے اِطلاع دی جائے۔"

"بہت بہتر، جناب۔ آپ کے ہر حُکم کی تعمیل حرف بہ حرف ہو گی۔"

"اگر یہ لوگ نہ بتائیں تو پھر انھیں سُرخ موت کے حوالے کر دیا جائے۔ بتا دیں تو انھیں یہیں رکھا جائے۔"

"بہت بہتر، جناب۔ جو حُکم۔"

آواز آنی بند ہو گئی۔ ایک بار پھر مشین میں سے مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ اُبھرنے لگی۔ اس کے بند ہوتے ہی سُرخ روشنی بھی بند ہو گئی۔

چابی گُم ہو گئی

مُنوّر علی خاں دم سادھ کر بیٹھ گئے۔ ان کے درخت کی طرف بڑھنے والا دُشمن اگر انھیں دیکھ لیتا تو وہ بہت بڑی مُصیبت میں گرفتار ہو سکتے تھے۔ وہ دو شاخوں کے درمیان میں پیر جمائے اُکڑوں بیٹھے تھے۔ اُن کی کمر ایک شاخ سے لگی تھی۔ ایک ہاتھ میں چاقُو اور دُوسرے میں پھندے کی رسّی تھی۔

وہ اس پر نظریں جمائے بیٹھے رہے۔ اب درخت کے تنے سے وہ صرف چند فٹ کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ وہ اپنی جگہ پر ہی رُک گیا۔ وہ درخت کی شاخوں میں بغور دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے وہاں کوئی بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ اس نے پستول والا ہاتھ سیدھا کر لیا۔ نال کا رُخ درخت کی طرف ہو گیا۔ مُنوّر علی خان کا دِل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ خطرناک پوزیشن میں تھے۔ خود فائر کر نہیں سکتے تھے۔ لے دے کے پھندا ہی استعمال کر سکتے

تھے، لیکن پھندا اس وقت تک اِستعمال کرنا ناممکن تھا جب تک وہ درخت کے عین نیچے نہ آ جاتا۔ دُوسری طرف وہ شش و پنج میں پڑ گیا تھا۔ مُنوّر علی خاں اسے سائے کی طرح نظر آ رہے تھے۔

آخر وہ یہ یقین کرنے کے لیے آگے بڑھا کہ درخت پر کوئی آدمی ہے یا کوئی جانور۔ اسے آگے بڑھتے دیکھ کر مُنوّر علی خاں چوکس ہو کر بیٹھ گئے۔ شکاری زندگی میں ایسے لمحے سینکڑوں مرتبہ پیش آئے تھے، جب وہ جھاڑیوں میں یا کسی درخت پر چھپے ہوتے اور شکار ان کی طرف بڑھ رہا ہوتا۔ لیکن آج کا شکار، ایک اِنسان تھا، جسے وہ موت کے گھاٹ اُتارنا نہیں چاہتے تھے۔ اگرچہ وہ ان کا دُشمن تھا۔ ان کا ایمان تھا کہ بُرے سے بُرے انسان کو سیدھے راستے پر لایا جا سکتا ہے۔

ان کا شکار درخت کے عین نیچے پہنچنے والا تھا۔ وہ پھندا پھینکنے کے لیے تیّار ہو گئے۔ پھندا پھینکنے کی تربیت اُنھوں نے افریقہ میں حاصل کی تھی۔ افریقی باشندوں کو اُنھوں نے ان پھندوں کے ذریعے شکار کھیلتے اکثر دیکھا تھا۔

اُنھوں نے دیکھا، ان کا دُشمن اب بالکل نیچے

کھڑا تھا اور بغور اُوپر دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس کا پستول والا ہاتھ اُوپر اُٹھا۔ شاید اس نے یہ جان لیا تھا کہ درخت میں ضرور اس کا دُشمن چھُپا بیٹھا ہے۔

اِدھر اُس نے پستول اُوپر اُٹھایا، اُدھر مُنوّر علی خاں کا ہاتھ چل گیا۔ ان کا نشانہ قابلِ تعریف تھا۔ پھندا بالکل ٹھیک نشانے پر گرا اور اس کے سر سے ہوتا ہوا گردن کے گرد کس گیا۔ مُنوّر علی خاں نے ایک ہلکا سا جھٹکا رسّی کو دیا۔ ان کے شکار کے ہاتھ سے پستول گر گیا اور دونوں ہاتھ گلے سے رسّی اُتارنے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن یہ ایسی گرہ نہ تھی جو ڈھیلی ہو جاتی، البتہ مُنوّر علی خاں چاہتے تو کسی ضرور جا سکتی تھی۔ دُشمن کا سانس رُکنے لگا تھا۔ پُوری کوشش کے باوجُود بھی وہ رسّی کو ڈھیلا نہ کر سکا اور نہ اس کے حلق سے آواز ہی نکل سکی۔

ایک منٹ بعد وہ دھڑام سے گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ مُنوّر علی خاں نے اسے گرتے دیکھا تو پھُرتی سے نیچے اُترے، اس کے ہاتھ پیر رسّی سے باندھے اور مُنھ میں رُومال ٹھونس دیا۔ اس کے بعد اُنھوں نے پھندا اس کے گلے سے نکال لیا۔

اس کام میں انھیں دو منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ اب وہ تیزی سے اس سمت میں چلنے لگے جس طرف انھیں کسی

عمارت کے آثار دکھائی دیے تھے۔

جارج نے سُرخ روشنی کے بند ہوتے ہی اِطمینان کا سانس لیا اور فوراً جنگل کی آوازوں والے آلے کا بٹن دبا دیا۔ آلے میں سے کوئی آواز سُنائی نہیں دے رہی تھی۔ سب اس کی طرف کان لگائے ہوئے تھے۔ کمرے میں قبرستان کا سا سنّاٹا تھا۔ آخر اس سنّاٹے کو آفتاب نے توڑا:

"تو یہ تھا "وہ"۔ مگر تم تو اس طرح ڈر گئے تھے جیسے وہ موت کا فرشتہ ہو۔ تم سب کی گھِگھّی بندھ گئی تھی اس کی آواز سُنتے ہی۔"

جارج نے بے خیالی کے عالم میں آفتاب کو دیکھا اور پھر سوچے سمجھے بغیر کہنے لگا "وہ ہمارے لیے موت کا فرشتہ ہی ہے۔"

"اگر ایسا ہی ہے تو تم اس کی نوکری چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟"

"نہیں چھوڑ سکتے۔ جس دن ہم نے ایسا اِرادہ کیا، وہ ہماری زندگی کا آخری دن ہوگا۔" جارج بولا۔ کامران مرزا نے آفتاب کو اِشارہ کیا تھا کہ باتیں کرتا رہے۔

"کمال ہے! آخر اسے کیسے پتا چل جائے گا؟ وہ کوئی جادُوگر تو ہے نہیں۔"

"بڑے بڑے جادوگر اس کے آگے پانی بھرتے ہیں۔"
جارج نے جواب میں کہا۔
"تو یوں کہو، وہ جادوگروں کا اُستاد ہے، یا پھر مشکیوں کا اُستاد ہے۔" آفتاب کے مُنھ سے نکل گیا۔
"خاموش!" جارج نے غُصّے سے سُرخ ہوتے ہوئے کہا "میں نے تم سے کہا تھا، اپنی زبان بند رکھنا۔"
"مم .... میں بھی بھُول گیا تھا۔ جج .... جیسے تم بھُول گئے تھے۔ ویسے یہ بھُولنے کا مرض بھی عجیب ہے۔ ایک بار ایک آدمی سانس لینا بھی بھُول گیا تھا۔ جب اسے یاد آیا تو وہ مر چکا تھا۔"
"مجھے ڈر ہے، کہیں تم بھی سانس لینا نہ بھُول جاؤ۔"
"کوئی بات نہیں۔ میرے ساتھی مجھے یاد دلا دیں گے۔ کیوں آصف، تم یاد دلا دو گے نا؟" آفتاب بولا۔
"بھلا یہ بھی کوئی پُوچھنے والی بات ہے۔ تم بھُول کر تو دکھاؤ۔ پھر دیکھو ہم یاد کراتے ہیں یا نہیں۔" آصف نے کہا۔
"شکریہ۔ تم میرے سچّے دوست ہو، کیوں کہ دوست وہ ہے جو مُصیبت میں کام آئے۔" آفتاب نے مُسکرا کر کہا۔
"تم یوں نہیں مانو گے۔ لے جاؤ اُنھیں قید خانے میں ان کا ساتھی گرفتار ہو کر آئے گا تو پھر اُنھیں مِلا

لوں گا۔ یہ تو میرا دماغ چاٹ جائیں گے۔" جارج نے چِلّا کر کہا۔
"اگر تمھارا یہ خیال ہے کہ قید خانے میں جا کر ہم مان جائیں گے تو بالکل غلط خیال ہے۔ دُوسری بات، میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ تمھارا دماغ کوئی شہد کا بنا ہوا نہیں ہے جو ہم چاٹیں گے۔ سنبھال کر رکھو اسے۔"
"لے جاؤ ان کو۔" اس نے گرج کر کہا۔
"لے جاؤ ہمیں۔" آفتاب نے اسی انداز میں کہا۔
"تمھارے اس ساتھی کے پکڑے جانے کی دیر ہے۔ اس کے بعد تم اس وقت کو رُوؤ گے جب یشوبا تمھارے گھر میں گھُسا تھا۔"
"اس وقت کو تو ہم پہلے ہی رو رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ آنکھوں میں آنسو نہیں آتے۔" آفتاب خاموش نہ رہ سکا۔
"تمھارا شاید دماغ خراب ہے۔" جارج نے جل بھُن کر کہا۔
"مُعاینہ کرانے کے بعد ہی کسی نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے۔"
"توبہ ہے! میں نے اپنی زندگی میں اِتنا باتونی لڑکا نہیں

دیکھا" جارج نے تنگ آ کر کہا۔ کامران مرزا مُسکرائے اور بغیر نہ رہ سکے۔

"یہ بات تم سے پہلے بھی کئی لوگوں نے بتائی ہے، اس لیے تم نے میری معلومات میں اضافہ نہیں کیا۔" آفتاب نے معصومیت سے کہا۔

جارج آفتاب کو کھا جانے والی نظروں سے گھُور کر رہ گیا۔ آخر اس نے چِلّا کر کہا:

"تم نے سُنا نہیں؟ میں نے کہا تھا، ان لوگوں کو لے جاؤ۔"

فوراً ہی چاروں کو گیس پستولوں کی زد پر لے لیا گیا اور انھیں دروازے کی طرف چلنے کا اشارہ کیا گیا۔ مُڑتے مُڑتے بھی آفتاب نہ رہ سکا۔ بول ہی پڑا:

"تم ہمیں بھیج رہے ہو۔ خیر، کوئی بات نہیں۔ پھر ملیں گے اگر خُدا لایا۔ خُدا حافظ۔"

وہ ہال سے نکل کر برآمدے میں چلنے لگے۔ آفتاب سب سے پیچھے تھا۔ اچانک وہ چلتے چلتے لڑکھڑا گیا۔ آصف اسے سہارا دینے کے لیے مُڑا، لیکن اتنی دیر میں آفتاب ایک پہرے دار سے ٹکرا گیا تھا۔ پہرے دار نے اسے ایک زور دار دھکا دیا اور وہ کئی فٹ تک لڑکھڑاتا چلا

گیا۔ پھر سنبھل کر بولا:

"معاف کرنا بھائی۔ میرا پاؤں پھسل گیا تھا۔"

"اندھے ہو؟ دیکھ کر نہیں چل سکتے؟"

"جناب! کہہ تو رہا ہوں، پاؤں پھسل گیا تھا۔ کیا تم بہرے ہو؟" آفتاب نے کہا۔

"میرے ساتھ کوئی ایسی ویسی بات نہ کرنا۔ وہ جارج ہی تھا جو تمھاری باتیں برداشت کرتا رہا۔"

"اور تم کیا کرو گے؟ آرام سے نہیں سنو گے تو کان بند کر لو گے۔ کیوں، ٹھیک ہے؟" آفتاب مُسکرایا۔

"میں پستول چلا دوں گا۔" اس نے غرّا کر کہا۔

"واہ! یہ ہو گا نا بہادری کا کام۔" آصف نے خوش ہو کر تعریف کی۔

"تم پُورے شیطان کے چیلے ہو۔" اس نے جھنجھلا کر کہا۔

"کیا کچھ لوگ آدھے شیطان کے چیلے بھی ہوتے ہیں؟"

"اگر اب بولے تو سچ مچ فائر کر دُوں گا۔"

"اچھّا۔ اب نہیں بولوں گا۔" آفتاب نے سہم جانے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔ کامران مرزا، آصف اور فرحت مُسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

اتنی دیر میں وہ قید خانے کے دروازے تک پہنچ چکے

تھے۔ دروازہ کھلا ہوا ہی تھا۔ وہ چُپ چاپ اندر داخل ہو گئے۔ اندر داخل ہونے والوں میں سب سے پہلا آفتاب ہی تھا۔ نہ جانے کیوں اس نے اندر جانے میں جلدی کی تھی۔

وہ پہرے دار جس سے آفتاب ٹکرایا تھا، اپنی جیب سے قید خانے کی چابی نکالنے لگا۔ پھر وہ چونک اُٹھا۔

"ارے! چابی کہاں گئی!" اس کے مُنھ سے نکلا۔ وہ تھر تھر کانپنے لگا تھا۔

"تم نے کہاں رکھی تھی؟" اس کے ساتھی نے پُوچھا۔

"اسی جیب میں تھی۔" اس نے بوکھلا کر کہا۔

"تب پھر وہ کہاں جا سکتی ہے۔ اچھی طرح دیکھو۔"

اس نے ایک بار پھر سب جیبوں کی تلاشی لی۔ اس کا رنگ سفید پڑ گیا۔ چابی کہیں نہیں تھی۔

"اُف خدا! اب کیا ہو گا!"

"ٹھہرو! وہ لڑکا تم سے ٹکرایا تھا نا؟" اس کے ساتھی نے چونک کر کہا۔

"ہاں، کیوں؟" اس نے حیران ہو کر پُوچھا۔

"اسی نے چابی تمھاری جیب سے نکالی ہو گی۔"

"تم سب اپنے ہاتھ اُوپر اُٹھاؤ۔ ہم تمھاری تلاشی لیں گے۔" اُنھوں نے اندر گھستے ہوئے کہا۔ اب وہ تینوں بھی

قید خانے میں کھڑے تھے۔

کامران مرزا چاہتے تو اس وقت ان تینوں سے نپٹ سکتے تھے لیکن ابھی وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پائے تھے۔ دُوسرے وہ مُنوّر علی خاں کے بارے میں بہت فکر مند تھے۔ وہ چابی کے متعلق بھی سوچ رہے تھے کہ کہاں گئی۔ اگر وہ آفتاب نے نکالی تھی تو اب برآمد ہونے والی تھی۔

چاروں نے ہاتھ اُوپر اُٹھا لیے۔ سب سے پہلے آفتاب کی تلاشی لی گئی۔ وہ دبے دبے لہجے میں کہہ رہا تھا:

"بھائی، میں کوئی جیب کترا تو ہوں نہیں۔ میرا تو پاؤں پھسل گیا تھا۔ مجھے معلوم ہوتا کہ اس پاؤں کے پھسلنے کی سزا تلاشی دینے کی صُورت میں ملے گی تو کبھی پاؤں کو پھسلنے نہ دیتا۔ اس صُورت میں میں اپنے پاؤں سے گزارش کرتا کہ ذرا کچھ دیر بعد میں پھسلے۔ خیر، تم اپنا اطمینان کر لو۔"

انھیں آفتاب کی جیبوں میں سے کوئی چابی نہ ملی۔ اس کے بعد آصف اور فرحت کی تلاشی لی گئی۔ کامران مرزا کو بھی نہیں بخشا گیا لیکن چابی کسی کے پاس سے برآمد نہیں ہوئی۔ اب تو اس کا مارے خوف کے بُرا حال ہو گیا۔ اُنھوں نے اس کی حالت کو حیرت زدہ ہو کر دیکھا۔ آفتاب سے رہا نہ گیا۔

"کیا وہ چابی سونے کی تھی؟" اس نے پُوچھا۔

"نہیں، لیکن تم نے یہ کیوں پوچھا؟" چابی والے نے کہا۔

"تم مرے جو جا رہے ہو۔ آخر ایک چابی کے لیے اس قدر فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اِدھر اُدھر کہیں گر گئی ہو گی۔ تلاش کرو۔ مل جائے گی۔"

"تم نہیں جانتے۔ اگر وہ چابی نہ ملی تو جارج مجھے کرسی پر بٹھا دے گا۔"

"تو پھر کیا ہوا۔ بیٹھ جانا۔ ہمارے ہاں تو لوگ کرسی پر بیٹھنے کے لیے مرے جاتے ہیں۔ کرسی کے لیے نہ جانے کیسے کیسے پاپڑ بیلے جاتے ہیں۔ تمھیں بیٹھے بیٹھے کرسی پر بٹھایا جا رہا ہے، اور تم ڈر رہے ہو۔ لاحول ولا قوۃ عجیب آدمی ہو۔"

"تم نہیں جانتے۔ اس کی کرسی کو تم کیا جانو۔" اس نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

اور پھر وہ قید خانے سے باہر نکل گئے۔ چابی والے نے دوسرے آدمی سے چابی لی اور قید خانے کا دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا۔

"یہ تو مسئلہ ہی حل ہو گیا۔ تم تو یوں ہی فکر کر رہے تھے۔" آفتاب نے ہنس کر کہا۔

"اس کے باوجود مجھے چابی کے گم ہونے کی رپورٹ دینی ہو

گی۔ یہاں کوئی بات چھپانے کی سزا سرخ موت ہے۔ اس کے ڈر سے لوگ کرسی کی سزا کو قبول کر لیتے ہیں۔ کم از کم زندہ تو بچ جاتے ہیں۔"

وہ تینوں وہاں سے چلے گئے۔ جس کی جیب سے چابی گم ہوئی تھی، اس کا حال بہت پتلا تھا۔ دونوں اسے سہارا دے کر لے گئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد آفتاب نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنے ساتھیوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور ایک کونے میں جا کر اپنے بالوں میں اُنگلیاں پھیرنے لگا۔

"کنگھا کرنے کا یہ اچھا طریقہ ہے۔" آصف چپ نہ رہ سکا۔

"اس قید خانے میں اور کنگھا کر بھی کیسے سکتے ہیں۔" فرحت بولی۔

کامران مرزا کے منھ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔ وہ آفتاب کو دیکھ رہے تھے۔ اچانک وہ سب چونک اُٹھے۔ آفتاب کی دو انگلیاں بالوں میں سے نکل آئی تھیں، اور ان میں دبی ہوئی چیز چابی کے سوا اور کچھ نہ تھی۔

سزا ملتی ہے

مُنوّر علی خاں تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ اب اور کسی مصیبت میں پھنسے بغیر اس ٹھکانے تک پہنچ جائیں جس میں ان کے دوست اور بچّوں کو لے جایا گیا ہے۔ انھیں پہلے ہی بہت دیر ہو چکی تھی۔

اس وقت بھی ان کے ایک ہاتھ میں پستول اور دوسرے میں چاقو تھا۔ وہ تھک کر چُور ہو چکے تھے۔ تین گھنٹے کی سخت جدّو جہد نے ان کا بُرا حال کر دیا تھا۔

اچانک ان کا دِل خوشی سے اُچھل پڑا۔ رات کی تاریکی میں ایک عمارت کے آثار دکھائی دے گئے تھے۔ انھیں بالکل یُوں لگا، جیسے وہ عمارت کوئی چھوٹا سا پہاڑ ہو۔ اُنھوں نے سوچا ضرور یہی دُشمنوں کا اڈّا ہے۔ وہ اور بھی تیزی سے قدم اُٹھانے لگے۔ یہاں تک کہ عمارت کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ اب وہ ایک درخت کی آڑ سے عمارت کا جائزہ لے رہے تھے۔ آس پاس کوئی شخص نظر نہیں آ رہا تھا۔ عمارت

ٹوٹی پھوٹی تھی۔ اُنھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اندر داخل ہو گئے۔ تاروں کی روشنی میں ان کے لیے عمارت کا جائزہ لینا مشکل نہ تھا۔

وہ حیران رہ گئے۔ عمارت کے کمرے بہت بڑے بڑے تھے۔ ہر کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ لیکن کسی کمرے میں کوئی فرنیچر وغیرہ نہ تھا۔ کوئی برتن نہ تھا۔ تمام کمرے خالی پڑے تھے اور گرد و غبار میں اٹے ہوئے تھے۔ یُوں لگتا تھا جیسے مدّتوں ان کی صفائی نہ کی گئی ہو۔

وہ سوچ میں پڑ گئے۔ اگر یہاں کچھ لوگ رہ رہے ہوتے تو کہیں تو کوئی برتن وغیرہ دکھائی دیتا، یا کسی کمرے میں تو صفائی وغیرہ نظر آتی۔ وہ ایک جگہ بیٹھ کر سوچنے لگے کہ کیا کریں! اس جنگل میں کسی دُوسری عمارت کو تلاش کرنا بھی جان جوکھوں کا کام تھا۔ اسی ایک عمارت کی کھوج میں انھیں کتنی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا، اور پھر دُشمن جنگل میں پھیلے انھیں تلاش کر رہے تھے۔ کسی نئی عمارت کو ڈھونڈتے ہوئے وہ پھر ان سے ٹکرا سکتے تھے۔

وہ مایُوس ہوتے جا رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ اب دن نکلنے پر ہی وہ ان لوگوں کے لیے کچھ کر سکتے

ہیں۔ اس سے پہلے نہیں۔ اس عمارت سے نکل کر ایک بار پھر جنگل میں جانا اپنی موت کو آواز دینے کے برابر تھا۔ تھکن کی وجہ سے اُنھوں نے کمر دیوار سے لگا لی اور اونگھنے لگے۔ اچانک وہ چونک کر سیدھے ہو گئے۔ دیوار میں انھیں ہلکی سی دھمک محسوس ہوئی تھی۔

اُنھوں نے سوچا، جو لوگ گیس پستول بنا سکتے ہیں، زہریلے تیر بنا سکتے ہیں، وہ ضرور کسی خفیہ ٹھکانے پر رہتے ہوں گے۔ تو..... تو کیا اس عمارت میں کوئی پوشیدہ جگہ موجود ہے جس میں وہ رہتے ہیں؟ ہاں، ضرور یہی بات ہے۔

وہ بے چینی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور دیواروں کو ٹھوک بجا کر دیکھنے لگے۔ لیکن آدھ گھنٹے کی چھان پھٹک کے باوجود کوئی کوشش بار آور نہ ہوئی۔ اس وقت انھیں ٹارچ کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ ٹارچ ہوتی تو وہ بہت کچھ کر سکتے تھے۔

یکایک وہ رُک گئے۔ ان کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ عمارت میں کسی جگہ گڑگڑاہٹ کی آواز پیدا ہوئی تھی۔ وہ دبے پاؤں آواز کی سمت بڑھے۔ اُنھوں نے ریوالور جیب سے نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ وہ برابر اس سمت میں بڑھتے

رہے، اگرچہ آواز رُک گئی تھی۔

اور پھر وہ اس کمرے کے دروازے تک پہنچ گئے، جس میں سے آواز آئی تھی۔ دیوار کے ساتھ لگ کر اُنھوں نے اندر دیکھا۔ اندھیرے میں انھیں کچھ آدمی ایک دیوار میں سے نکلتے نظر آئے۔ وہ حیران رہ گئے۔ اُنھوں نے اپنی زندگی میں کبھی آدمیوں کو دیوار میں سے نکلتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ سمجھے، اندھیرے کی وجہ سے انھیں دروازہ نظر نہیں آرہا ہے۔

دیوار سے نکلنے والے اب دروازے کی طرف بڑھے اس وقت گڑگڑاہٹ دوبارہ ہوئی۔ وہ ایک دم پیچھے ہٹ گئے۔ اور کھسکتے چلے گئے۔ انھوں نے کمرے سے نکلنے والے آدمیوں کو عمارت سے نکل کر جنگل میں غائب ہوتے دیکھا۔ ان کے غائب ہوتے ہی وہ اپنی جگہ سے آگے بڑھے اور اس کمرے میں داخل ہو گئے۔ اب انھیں یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ دشمنوں کا ٹھکانا یہی ہے اور ان کے دوست اور بچے اسی جگہ قید ہیں۔

کمرے میں داخل ہونے کے بعد وہ سیدھے دیوار کی طرف گئے۔ یہ دیکھ کر اُن کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ دیوار میں کوئی دروازہ نہ تھا۔ وہ چکرا کر رہ گئے۔ انھوں

نے پوری دیوار کو ٹٹول کر دیکھا۔ لیکن کوئی بٹن وغیرہ ہاتھ سے نہ ٹکرایا۔ اب وہ یا تو صبح کوشش کر سکتے تھے یا پھر اُن لوگوں کے واپس آنے کا اِنتظار کرتے، تاکہ اندھیرے میں اُن کے پیچھے اندر داخل ہو سکیں۔ انھیں یہی بہتر معلوم ہوا۔ وہ کمرے کے ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گئے اور دُشمنوں کا اِنتظار کرنے لگے۔

ان کو بھیجنے کے بعد بھی جارج جُوں کا تُوں بیٹھا رہا۔ اس کی آنکھوں میں سوچ اور فکر کے آثار جھلک رہے تھے۔ جنگل کی آوازوں والے آلے میں سے پھر کوئی آواز سُنائی نہیں دی تھی۔ ان سب کے لیے یہ بات بھی حیرت کا باعث تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جارج کے آدمی ابھی تک جنگل میں چھپے ہوئے شخص کو پکڑنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ اچانک اُن کے کان کھڑے ہو گئے۔ آلے میں سے چند لوگوں کے بُری طرح ہانپنے کی آوازیں آئی تھیں۔ پھر کسی نے کہا:

"ارے! یہ ادھر کیا چیز پڑی ہے!"

"یہ ..... یہ تو کوئی آدمی ہے۔" آواز آئی۔

"یہ کہیں وہی شخص نہ ہو۔ ہو سکتا ہے بلّیوں نے

اسے زخمی کر دیا ہو، اور وہ یہاں گر کر بے ہوش ہو گیا ہو۔" کسی نے کہا۔

"آؤ، دیکھیں۔"

"کہیں یہ کوئی چال نہ ہو۔ ہمیں اِحتیاط سے آگے بڑھنا چاہیے۔"

جارج، اُستاد اور دُوسرے لوگ غور سے یہ آوازیں سُن رہے تھے۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر ایک شخص نے خوف زدہ لہجے میں کہا "ارے! یہ تو نمبر اُنّیس ہے۔ اوہ! اسے کیا ہوا!"

"اس کے تو مُنھ میں رومال ٹھنسا ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے نمبر اُنّیس اس شخص سے ٹکرا گیا تھا مگر وہ اسے بے ہوش کر کے بھاگ نکلا۔"

"اوہ! اسے جلدی سے کھول کر ہوش میں لاؤ۔"

اسی وقت جنگل میں جارج کی آواز گونجی:

"میں نے تمھاری سب باتیں سُن لی ہیں۔ جنگل میں پھیل جاؤ۔ اسے ہر حال میں تلاش کرو۔ میں کچھ اور آدمی تمھاری مدد کے لیے بھیج رہا ہوں۔" جنگل میں موجود لوگوں کو یہ پیغام دینے کے بعد اس نے ایک آلے میں کہنا شروع کیا:

"جنگل میں جو آدمی بھیجے گئے تھے، وہ ابھی تک اس شخص کو پکڑنے میں کامیاب نہیں ہوئے، اس لیے

ان کی مدد کے لیے دس آدمی اندر چلے جائیں۔ میں دروازہ کھول رہا ہوں۔" یہ کہہ کر اُس نے ایک بٹن اس طرح دبایا کہ کمرے میں موجود کوئی شخص بھی نہ دیکھ سکا کہ کون سے بٹن کو دبایا گیا ہے۔

ابھی وہ مُڑا بھی نہ تھا کہ کمرے میں وہی سُرخ روشنی پھیل کر جلنے بجھنے لگی۔ جارج کا رنگ زرد ہو گیا۔ اس قدر جلد دُوسرا پیغام آج تک موصول نہیں ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دُوسرے بھی باادب کھڑے ہو گئے۔ مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی آواز ختم ہوتے ہی وہی آواز آئی:

"تم نے مجھے اس شخص کے بارے میں نہیں بتایا جو جنگل میں چھپا ہوا ہے اور جسے تمھارے آدمی تلاش کر رہے ہیں؟"

"جج .... جی .... بات در اصل یہ ہے کہ آپ کا پیغام ملنے سے صرف چند منٹ پہلے جنگل سے بلّیوں کے چیخنے کی آواز آئی تھی۔ پھر ایک دھماکا ہوا جس کے ساتھ ہی بلّیوں کی آوازیں دب گئیں۔ اس سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ جنگل میں ضرور کوئی دُشمن موجود ہے اور وہ بلّیوں کی زد سے بچ نکلا ہے۔ میں نے اسے پکڑنے کے لیے آدمی بھیج دیے۔ آپ سے ذکر اس لیے نہیں کیا کہ ابھی یہ بات ثابت

نہیں ہوئی کہ جنگل میں واقعی کوئی دُشمن چھپا ہوا ہے۔ اس کی گرفتاری کے بعد ہی کوئی نتیجہ نکالا جا سکتا تھا۔"

"ہُوں! مسٹر جارج، آج سے پہلے شاید تمھیں یہ بات معلوم نہیں تھی کہ جس طرح تم اپنے تمام آدمیوں اور غلاموں کی بات چیت اپنے کمرے میں بیٹھ کر سُن سکتے ہو، اسی طرح میں بھی تمھاری تمام حرکتوں سے باخبر رہتا ہوں۔ تم نے زندگی میں آج پہلی بار مجھ سے بات چھپائی ہے۔ اگرچہ میں تمھیں معاف کرنا چاہتا ہوں، لیکن کیا کروں۔ یہ بات میرے اُصول کے خلاف ہے۔"

"مم.... میرے آقا، یہ میری پہلی غلطی ہے۔" جارج نے لرزتی آواز میں کہا۔

"اسی لیے میں تمھیں صرف نو سیکنڈ کے لیے کُرسی کی سزا دیتا ہوں۔ تم پہلی کُرسی پر نو سیکنڈ کا وقت سیٹ کرو اور اس پر بیٹھ جاؤ۔"

"میرے آقا، میں آپ کا خادم ہوں۔"

"میں جانتا ہوں، تم میرے سب سے وفادار آدمی ہو۔ لیکن میں مجبُور ہوں۔ میں نے تمھارے لیے سب سے ہلکی سزا تجویز کی ہے۔"

"بہت اچھا میرے آقا، اگر آپ اسی میں خوش ہیں تو میں

یہ سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔" جارج نے کہا۔

"تم بہت شاندار آدمی ہو۔ یاد رکھو! آیندہ کبھی ایسی حرکت نہ کرنا۔" آواز نے کہا اور خاموش ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی بکبھتوں کی جھنجھناہٹ گونجی اور پھر ——— سُرخ روشنی بھی غائب ہو گئی۔

چند سیکنڈ کے لیے کمرے میں موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ ہر شخص پتھر کے بُت کی مانند ساکت تھا۔ ان کی آنکھیں خوف کی وجہ سے پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ کسی کے مُنھ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔ آج تک جارج کو کوئی سزا نہیں دی گئی تھی۔ اس زمین دوز دُنیا کا مالک تو صرف اسی کو خیال کیا جاتا تھا۔ وہ جو چاہتا تھا، کرتا تھا۔ اس نے اپنے بیسیوں آدمیوں کو معمولی معمولی غلطیوں پر کُرسی پر دو منٹ کی سزا دی تھی۔ آج معلوم ہوا کہ اس دُنیا کی باگ ڈور بھی اس کے ہاتھ میں نہیں تھی اور کُرسی کی سزا اسے بھی مل سکتی تھی۔ اگرچہ اسے صرف نو سیکنڈ کی سزا ملی تھی، لیکن اس کا رنگ سفید پڑ چکا تھا، کیوں کہ ان کُرسیوں پر بیٹھنے والوں کو چیختے چلّاتے وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا رہا تھا، اور اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ دُوسرے اسے اس حال میں دیکھیں۔

اس نے نگاہیں اُوپر اُٹھائیں اور سانپ کی سی پھنکارتی آواز میں کہا:

"تم سب جا سکتے ہو۔"

اُستاد اور اُس کے ساتھی سر جھکائے ہال سے نکل گئے۔ اُن کے جانے کے بعد اس نے ایک بٹن دبایا۔ دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔ اب یہ اُس وقت تک نہیں کھل سکتا تھا جب تک وہ دوبارہ بٹن نہ دبا دیتا۔ اسے اطمینان تھا کہ اس کی آواز کوئی نہ سُن سکے گا۔

دروازہ بند ہوتے ہی اس نے پہلی کُرسی کو نو سیکنڈ پر سیٹ کیا، اپنی کُرسی سے اُٹھا اور لڑکھڑاتے قدموں سے پہلی کُرسی کی طرف بڑھا۔ اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار طاری تھے۔ آخر وہ کُرسی پر بیٹھ گیا اور اس کے دائیں بازو پر لگے ہوئے سوئچ کو دبا دیا۔

اچانک ایک چیخ اس کے حلق سے نکلی اور پھر چیخوں کا یہ سلسلہ بلند سے بلند ہوتا گیا۔

گونگا اُلّو

چابی کو دیکھ کر اُن کی آنکھیں مارے حیرت کے کُھلی کی کُھلی رہ گئیں۔ اُن کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ چابی آفتاب نے اُڑائی ہو گی۔ وہ تو یہی سمجھ رہے تھے کہ اس شخص سے چابی کہیں گر گئی ہو گی۔ سب کی تلاشی لینے کے بعد تو یہ خیال اور بھی پُختہ ہو گیا تھا لیکن اب چابی آفتاب کی دو اُنگلیوں میں موجُود تھی۔

"کمال ہے ....!" آصف کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ کامران مرزا نے ایک دم اپنا ہاتھ اس کے مُنھ پر رکھ دیا اور ان سب کو خاموش رہنے کا اِشارہ کیا۔ انھیں یاد آگیا کہ یہاں کی جانے والی ہر بات جارج سُن لیتا ہے۔ شاید آصف یہ کہنا چاہتا تھا کہ تم جیب کترے کب سے بن گئے۔ وہ سمجھ گئے کہ آصف یہی کہنا چاہتا تھا، اس لیے مُسکرا کر رہ گئے۔

کامران مرزا نے انھیں ہدایت کی کہ اِشاروں میں بات کی جا سکتی ہے۔ اگرچہ شُروع شُروع میں یہ کام مُشکل لگے گا۔

اِشاروں میں بات کرنے کی ابتدا کامران مرزا ہی نے کی۔ اُنھوں نے آفتاب کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا:

"تم نے کمال کر دیا! یہ ایک بہت ہی شان دار کام تھا، اور پھر مزے کی بات یہ کہ تم نے چابی ایسی جگہ چھُپائی کہ اُن کے فرشتوں کا خیال بھی وہاں نہیں جا سکتا تھا۔"

"میں تو مان گیا اسے۔ یہ ہم سب سے بڑا جیب کترا ہے۔" وہ اشاروں کے ساتھ ساتھ اپنے ہونٹ بھی ہلا رہے تھے، لیکن ہونٹوں سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی۔

"تمھاری وجہ سے اس غریب کو کُرسی پر بٹھایا جائے گا۔" آصف نے کہا۔

"اگر تمھیں اس سے اتنی ہی ہمدردی ہے تو اس کی جگہ خود بیٹھ جاؤ۔" آفتاب نے کہا۔

"اب ہم جب چاہیں، اس قیدخانے سے نکل سکتے ہیں۔" فرحت نے کہا۔

"لیکن ہم اس وقت تک ایسا نہیں کریں گے جب تک تمھارے اُلّو کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو جائے۔" کامران مرزا بولے۔

"لیکن وہ یہاں کیسے پہنچ سکیں گے؟ ہو سکتا ہے، وہ اس زمین دوز دُنیا کے اُوپر جو عمارت ہے، اس تک پہنچ جائیں،

لیکن وہ اسے غیر آباد سمجھ کر جنگل میں کسی دوسرے ٹھکانے کو تلاش کرنے لگیں گے۔" فرحت نے کہا۔

"ہاں، اس کا بھی امکان ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ پکڑے جائیں۔"

"سوچا تھا کیا، کیا ہو گیا!" آصف نے کہا۔

"کیا تم گانا گانے کا ارادہ رکھتے ہو؟" آفتاب نے ہنس کر کہا۔

"نہیں۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ سکیم کیا تھی اور یہاں پہنچ کر حالات کیا پیش آ گئے!" آصف نے کہا۔

"فکر مت کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے!" کامران مرزا نے انھیں دلاسا دیا۔

"سوال یہ ہے کہ اگر ہم اس قید خانے سے نکل بھی جائیں تو جنگل میں کیسے پہنچیں گے؟ خفیہ راستہ کیسے کھلتا ہے یہ اُستاد اور جارج کے سوا کسی کو بھی معلوم نہیں!" آفتاب نے کہا۔

"اُستاد کو بھی صرف باہر سے اندر آنے کا راستہ معلوم ہے۔ اندر سے باہر جانے کا دروازہ کیسے کھلتا ہے، یہ اسے بھی معلوم نہیں۔ یہ صرف جارج کو معلوم ہے۔ یاد نہیں، اس

نے جب منوّر علی خاں کی تلاش میں آدمیوں کو بھیجا تھا تو یہ بھی کہا تھا کہ میں دروازہ کھول رہا ہوں!"

"اوہ! ہاں۔ یاد آیا۔ اس نے کہا تھا!" فرحت بولی۔

"اور اس کے ساتھ ہی اس نے کوئی بٹن دبایا تھا لیکن کون سا؟ یہ شاید کوئی بھی نہ دیکھ سکا!" آصف نے کہا۔

"ہاں، شاید کوئی بھی نہ دیکھ سکا!" کامران مرزا نے کہا۔ پھر اچانک انھیں کوئی خیال آیا۔ اُنھوں نے اشاروں کے بجائے حلق سے آواز نکالتے ہوئے کہا:

"کوئی بات کرو۔ اتنی دیر سے چُپ کیوں ہو؟ کیا اس قید خانے میں آ کر تمھاری زبانوں میں زنگ لگ گیا ہے؟"

وہ ان کا مطلب سمجھ گئے۔ اُنھوں نے کافی دیر سے آواز سے کوئی بات نہ کی تھی۔ کہیں جارج کو شک نہ ہو جائے۔ اس خیال سے کامران مرزا نے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کا پروگرام بنایا۔

"کیا بات کریں، ابّا جان۔ اس قید خانے میں کوئی بات سُوجھ ہی نہیں رہی!"

"تو سُوجھے بغیر ہی کرنا شروع کر دو!" کامران مرزا نے ترکیب بتائی۔

"بھئی واہ! ترکیب تو بہت زور دار ہے۔ خیر، تو سُنیے۔

میں نے یہاں سے باہر نکلنے کی ترکیب سوچ لی ہے۔ لیکن ہم یہاں سے تنہا نہیں جائیں گے۔" آفتاب بولا۔

"تنہا نہیں جاؤ گے؟ تو کیا جارج کو بھی ساتھ لے جاؤ گے؟" کامران مرزا نے کہا۔

"جی ہاں۔ اسے بھی لے جائیں گے، اور اس کے ساتھ ان بے چاروں کو بھی ضرور لے جائیں گے جو قیدیوں کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ہم انھیں لے جا کر سورج کے سامنے کھڑا کر دیں گے اور ان سے کہیں گے کہ لو، سورج کو جی بھر کر دیکھ لو۔ زمین دوز دنیا میں گزارے ہوئے دنوں کی کسر پوری کر لو۔"

"بہت نیک ارادہ ہے۔ ہم اس نیک کام میں تمھارا ساتھ دیں گے۔" آصف نے کہا۔

"تو آؤ چلیں۔ ان لوگوں سے ملاقات کریں۔" آفتاب نے خوش ہو کر کہا۔

"اندھے ہو؟ نظر نہیں آتا، دروازہ بند ہے!"

"کیا تم بھول گئے کہ یہ باتیں ہم بغیر سمجھے بوجھے کر رہے ہیں؟" آفتاب مسکرایا۔

"اوہ! واقعی میں بھول گیا تھا۔" آصف نے کہا۔

"آئندہ ایسی غلطی نہ کرنا۔" آفتاب نے کہا۔

"بہت بہتر۔" آصف نے جھک کر کہا۔

"میرا خیال ہے، رات بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ ان اوٹ پٹانگ باتوں کا پروگرام کل پر چھوڑو اور سونے کی تیاری کرو۔ کیا خیال ہے؟" کامران مرزا نے کہا۔

پھر وہ سب لیٹ گئے اور آنکھیں بند کر لیں۔ قید خانے میں خراٹے گونجنے لگے، لیکن در اصل ان میں سے خراٹے کوئی بھی نہیں لیتا تھا، جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ جاگ رہے تھے اور دوسروں کے لیے سو بھی رہے تھے۔

منور علی خاں تقریباً ایک گھنٹے تک وہاں دبکے رہے، تب کہیں جا کر انھوں نے قدموں کی آواز سنی۔ وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ رات کی تاریکی میں اس کا امکان نہیں تھا کہ وہ دیکھ لیے جاتے، پھر بھی انھوں نے ریوالور نکال لیا۔ اگرچہ وہ جانتے تھے کہ گیس پستولوں کی موجودگی میں ان کا ریوالور کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

آنے والے بوجھل قدموں سے آ رہے تھے۔ شاید وہ جہاں گئے تھے، وہاں سے ناکام لوٹے تھے۔ جوں ہی وہ کمرے میں داخل ہوئے، گڑگڑاہٹ کی آواز پیدا ہوئی۔ منور علی خاں نے دیوار میں سے ایک دروازہ نمودار ہوتے دیکھا۔

وہ دیوار سے لگ کر کھڑے ہوگئے اور دروازے کی طرف سرکنے لگے۔ آنے والے ہیں کے قریب تھے۔ وہ ایک ساتھ کمرے میں، داخل ہوئے تھے اور دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ سب کے سب خاموش تھے، جیسے کسی عزیز کو دفن کر کے آ رہے ہوں۔ پھر وہ دروازے میں داخل ہو کر سیڑھیاں اُترنے لگے۔

جب آخری آدمی نے دروازے پر پاؤں رکھا تو مُنوّر علی بھی اس کے پیچھے دبے پاؤں دروازے میں داخل ہوگئے کیوں کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ اندر داخل ہوتے ہی دیوار کے ساتھ لگ کر سیڑھیاں اُترنے لگے۔ آخری آدمی اب اُن سے کافی آگے جا رہا تھا۔ اُنھوں نے اپنی رفتار جان بوجھ کر کم کر دی تھی۔ سب سے نچلی سیڑھی کے بعد انھیں مدّھم سی روشنی کی جھلک نظر آئی تھی۔ وہ ان سب کے پیچھے روشنی میں نہیں جا سکتے تھے۔ دیکھ لیے جاتے تو اُن کی مصیبت آ سکتی تھی۔

چند منٹ بعد وہ زینے میں تنہا کھڑے تھے۔ گڑگڑاہٹ کی آواز کے ساتھ دروازہ بند ہو چکا تھا۔ اب وہ باہر نہیں جا سکتے تھے۔ اب تو انھیں آگے بڑھنا تھا اور انھیں وہ کہاوت یاد آ رہی تھی، جب اوکھلی میں سر دیا

تو مُوسلوں کا کیا ڈر۔ اس وقت وہ سچ مچ یہ محسوس کر رہے تھے جیسے اُنھوں نے اوکھلی میں سر دے دیا ہو۔ اب کسر موسلوں کی تھی۔

آخر وہ آگے بڑھے۔ آخری سیڑھی پر پہنچ کر اُنھوں نے خود کو ایک طویل برآمدے کے سامنے پایا۔ برآمدے میں روشنی ہو رہی تھی، لیکن وہ یہ نہ دیکھ سکے کہ روشنی کہاں سے آ رہی ہے۔ برآمدے میں کوئی نہ تھا۔ باہر سے آنے والے بھی نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔ برآمدے کے دونوں طرف کمروں کے دروازے تھے۔ ایک جگہ انھیں برآمدے کا موڑ نظر آیا۔ رات کے بارہ بج رہے تھے۔ شاید سب لوگ سو چکے تھے۔ موت کی سی خاموشی طاری تھی۔

وہ دبے پاؤں برآمدہ طے کر کے موڑ مُڑ گئے۔ اب ان کے سامنے ایک اور برآمدہ تھا۔ اس کے دونوں طرف بھی بڑے بڑے دروازے تھے۔ اس برآمدے کے آخر میں بھی ایک موڑ تھا۔ وہ سمجھ گئے کہ چوکور جگہ ہے۔ اس کے چاروں طرف برآمدے ہیں۔ وہ چلتے رہے۔ ابھی تک انھیں کسی کمرے کا دروازہ کھلا نظر نہیں آیا تھا، اور نہ کوئی آدمی کسی برآمدے میں دکھائی دیا تھا۔ اُنھوں نے کسی کمرے کا دروازہ کھولنے کی کوشش نہیں کی۔

ایک موڑ مڑتے ہی وہ چونک اُٹھے۔ اس برآمدے کے آخر میں انھیں کوئی اور موڑ نظر نہیں آیا تھا۔ البتہ اس کے آخر میں ایک بہت بڑا دروازہ تھا اور وہ کھلا تھا۔ وہ محتاط ہو کر آگے بڑھنے لگے۔ یہاں بھی وہی ہلکی سی روشنی تھی۔ وہ دُور سے یہ نہ دیکھ سکے کہ اس کمرے میں کیا ہے۔

اب انھوں نے خوف کو پرے جھٹک دیا تھا۔ وہ یہ جان چکے تھے کہ کامران مرزا اور بچے یہیں کہیں ہیں۔ وہ اس کمرے کے نزدیک پہنچ گئے۔ یہ ایک بہت بڑا ہال تھا۔ وہ بے دھڑک ہال میں داخل ہو گئے۔ ہال کے دونوں طرف کوٹھڑیاں سی تھیں اور ان میں لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں لگی تھیں۔ وہ سمجھ گئے کہ یہ دشمنوں کا قیدخانہ ہے۔ وہ پہلی کوٹھڑی کی طرف بڑھے۔ اس کے فرش پر ایک آدمی پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ وہ آگے بڑھے تو دو بدصورت آدمی فرش پر لیٹے نظر آئے۔ اسی طرح انھیں ہر کوٹھڑی میں کوئی نہ کوئی قیدی نظر آیا۔

اچانک وہ ٹھٹک کر رک گئے۔ ایک کوٹھڑی میں انھیں وہ چاروں نظر آگئے تھے۔ وہ سلاخوں کو پکڑ کر آگے جھک کر انھیں دیکھنے لگے۔ دوسرے ہی لمحے وہ حیران رہ گئے۔

وہ چاروں خراٹے لے رہے تھے جب کہ ان میں سے کسی کو بھی سوتے میں خراٹے لینے کی عادت نہ تھی۔

ٹھیک نو سیکنڈ بعد جارج کی چیخوں نے رُکنے کا نام لیا۔ وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ سر سے پاؤں تک پسینے میں نہا گیا تھا۔ لڑکھڑاتا ہوا کُرسی سے اُٹھا اور بمشکل اپنی کُرسی تک پہنچا۔ اس نے کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھا۔ بارہ بج رہے تھے۔ ابھی تک جنگل سے کوئی پیغام موصول نہیں ہوا تھا۔ آخر اس نے خود ہی ایک آلے کے پاس مُنھ لے جا کر کہا:

"ہیلو! کیا ابھی تک وہ گرفتار نہیں ہو سکا؟ تم سب مل کر ایک آدمی کو گرفتار نہیں کر سکے؟ فوراً جواب دو۔"

"جناب، ہم جنگل کا کونا کونا چھان چکے ہیں۔ مگر اس کا کوئی پتا نہیں چلا۔"

"اچھا، تم لوگ واپس آ جاؤ۔ دیکھا جائے گا۔ ٹھیک دس منٹ بعد میں دروازہ کھول دُوں گا۔ اس سے پہلے تم دروازے والے کمرے میں پہنچ جاؤ۔"

"بہت بہتر، جناب۔" آواز آئی۔

دس منٹ انتظار کرنے کے بعد اس نے وہی بٹن دبایا، اور پھر زینے پر قدموں کی آواز سُننے لگا۔ جب آواز

آنا بند ہو گئی تو اس نے اس بٹن کو دبا کر دروازہ بند کر دیا۔

"آج کا کام ختم ہوا۔ اس وقت سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں بند ہو چکے ہیں۔ کسی کو کمرے کا دروازہ کھولنے کی اجازت نہیں۔ میں بھی اپنے کمرے میں آرام کروں گا۔ آج تک کسی کو یہ تک معلوم نہیں ہو سکا کہ میرا کون سا کمرا ہے۔" یہ بڑبڑاتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکلا باہر بھی ایک بٹن لگا تھا۔ اسے دباتے ہی دروازہ بند ہو گیا۔ وہ پھر بڑبڑانے لگا:

"کوئی میرے کمرے میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ وہ جانتے ہیں، اس کمرے میں موت کا سامان تیار رہتا ہے۔"

اب وہ ایک برآمدے میں چل رہا تھا۔ اچانک اس کے اُٹھتے قدم رُک گئے۔ اس نے جو کچھ دیکھا، اس کے لیے بہت حیرت انگیز تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس کے لیے اس دُنیا میں شاید اس سے زیادہ حیرت ناک بات کبھی نہیں ہوئی تھی۔

کوئی اس سے کافی فاصلے پر برآمدے میں چلا جا رہا تھا۔ وہ دبے پاؤں اس کے پیچھے چلنے لگا۔ ساتھ ہی اسے

اپنی خطرناک پوزیشن کا احساس ہوا۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا، پھر بھی اس نے اگلے آدمی کا تعاقب جاری رکھا۔ برآمدوں میں مُڑتے مُڑتے آخر وہ قید خانے کے دروازے میں اسے داخل ہوتا دکھائی دیا۔ اور پھر اس نے دیکھا کہ وہ اس کوٹھڑی کے سامنے رُک گیا ہے جس میں کامران مرزا اور بچے بند تھے۔

وہ رُک گیا۔ چند لمحے تک کھڑا سوچتا رہا۔ پھر واپس مُڑا اور برآمدے طے کرتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچا۔ دُوسرے ہی لمحے وہ اپنی کُرسی پر بیٹھا اُستاد کے کمرے کی گھنٹی کا بٹن دبا رہا تھا۔ فوراً ہی اُستاد کی آواز سُنائی دی:

"میں جاگ گیا ہوں، جناب۔ کیا بات ہے؟"

"ہماری اس دُنیا میں کوئی اجنبی گھُس آیا ہے، اور برآمدوں سے ہوتا ہوا قید خانے تک جا پہنچا ہے۔"

"نہیں! یہ کیسے ہو سکتا ہے!" اُستاد نے بوکھلا کر کہا۔

"میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔ وہ شاید وہی ہے جو بلّیوں سے بچ نکلا تھا اور جسے ہمارے آدمی گرفتار نہیں کر سکے تھے۔ وہ عمارت تک پہنچ گیا ہوگا، اور جب وہ لوگ جنگل سے واپس آئے ہوں گے تو ان کے پیچھے پیچھے اندر آ گیا ہوگا۔"

"اوہ! ممکن ہے، مگر اب وہ بھاگ کر کہاں جا سکتا ہے؟"

"ٹھیک ہے۔ لیکن اسے گرفتار تو کرنا چاہیے۔ یہ بھی تو ٹھیک نہیں کہ وہ ساری رات یہاں آزادانہ سیر کرتا پھرے۔"

"بہت بہتر۔ میں ابھی اسے گرفتار کیے لیتا ہوں۔" اُستاد نے کہا اور گفت گو کا سلسلہ بند ہو گیا۔

اب اُستاد نے ایک بٹن دبایا اور اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔ ایک برآمدے کے موڑ پر اس کے پانچ ساتھی کھڑے تھے۔

"کیا بات ہے، اُستاد؟ خیر تو ہے؟ یہ اس وقت کیا کام پڑ گیا؟"

"ایک شخص نیچے آ گیا ہے۔" اُستاد نے بتایا۔

"کیا!!!" ان سب کے مُنھ سے نکلا۔

"ہاں۔ مسٹر جارج نے یہ بات مجھے بتائی ہے۔"

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آج تک ایسا نہیں ہوا۔" ایک نے کہا۔

"جو لوگ جنگل میں چھپے ہوئے دُشمن کو تلاش کرنے گئے تھے، وہ شاید ان کے پیچھے اندر داخل ہو گیا ہے۔"

"اوہ! پھر تو وہ لوگ مارے گئے۔ انھیں کُرسیوں پر بیٹھنا ہو گا۔"

"یہ تو خیر صُبح ہو گا، اس وقت تو ہمیں اسے پکڑ کر بند کرنا ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔"

"اس کے پاس ہتھیار ضرور ہوں گے۔"

"فکر نہ کرو۔ اس نے حملہ کرنے کی کوشش کی تو اپنی موت کو خود ہی آواز دے گا۔" اُستاد نے کہا اور اُن کے آگے آگے چلنے لگا۔

ان کا رُخ قید خانے کی طرف تھا۔

مُنوّر علی خاں تھوڑی دیر تک ان کو خرّاٹے لیتے سُنتے رہے۔ پھر اُنھوں نے دِل ہی دِل میں کہا "کمال ہے! یہ لوگ یہاں آتے ہی خرّاٹے لینا سیکھ گئے! اِتنی حیرت انگیز تبدیلی اور اس قدر جلد!"

پھر وہ آہستہ سے کھنکارے۔ آفتاب کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے آنکھوں کی جھری میں سے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں کوئی کھڑا تھا۔ اس نے سوچا، پہرے دار ہو گا۔ یہ سوچتے ہی اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ مُنوّر علی خاں نے اب ہلکے سُروں میں سیٹی بجائی۔ آفتاب سمجھا، پہرے دار وقت گزارنے کے لیے سیٹی بجا رہا ہے، یا پھر ہو سکتا ہے، وہ موسیقی کا بہت شوقین ہو۔ اِتنی دیر میں کھنکارنے اور

پھر سیٹی بجانے کی آواز دُوسروں کے کانوں میں بھی پُہنچ چکی تھی۔ اُنھوں نے کنکھیوں سے دیکھا اور آفتاب کی طرح دوبارہ آنکھیں بند کرلیں۔

"شو...... شو....." مُنوّر علی نے ہونٹوں سے آواز نکالی۔

"کیوں تنگ کرتے ہو، بھائی؟ زندگی میں پہلی بار تو اس قدر آرام دہ بستر نصیب ہوا ہے۔ نیند بھی اس قدر گہری آئی ہے کہ خرّاٹے لینے لگے ہیں۔" آفتاب نے دِل ہی دِل میں کہا اور ٹس سے مس نہ ہوا۔

مُنوّر علی خان نے سوچا، یہ لوگ اس طرح نہیں جاگیں گے۔ اُنھوں نے اُلّو کی ہلکی سی آواز نکالی۔ یہ ایک مخصُوص اِشارہ تھا۔ اس آواز کے نکالنے میں وہ بہُت ماہر تھے۔

"ہائیں! یہاں تو اُلّو بولنے لگے۔" آصف نے چونک کر کہا۔

"کیا کہا؟ اُلّو؟ کہاں ہے اُلّو؟ یہاں اُلّو کہاں سے آیا؟ عجیب اُلّو ہو تم۔" آفتاب بولا۔

"میں نے تم سے یہ کب کہا تھا کہ اُلّو کی گردان کرو۔" فرحت نے مُنھ بنا کر کہا۔

"اچھا! نہیں کہا تھا؟" آفتاب نے حیرت ظاہر کی، اور پھر اچانک اس کے مُنھ سے نکلا:

"ارے! اوہ! ہائیں!"

"اب تم بھی اُلّو کی بولی بولنے لگے۔" آصف نے کہا، مگر آفتاب نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ تو سکتے کے عالَم میں رہ گیا تھا۔ اس نے اُلّو کی آواز پر اب توجّہ دی تھی۔ اس نے پُوری آنکھیں کھول دیں اور دھک سے رہ گیا۔

"معلوم ہوتا ہے، تم اُلّو میں تبدیل ہو گئے ہو، جو زبان سے کوئی لفظ نہیں نکل رہا۔ اگر ایسی ہی بات ہے تو اُلّو کی بولی ہی سُناؤ کہ وقت کٹے۔" آصف نے اس کا مذاق اُڑایا، لیکن وہ اس پر بھی کچھ نہ بولا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُلّو میں تبدیل ہونے کے ساتھ ساتھ گُونگا بھی ہو گیا ہے۔" فرحت نے کہا۔

"تُمھارا مطلب ہے، گُونگا اُلّو؟" آصف نے کہا۔

"ہاں۔" فرحت مُسکرائی۔ ان کی باتیں سُن کر کامران مرزا بھی کسمسائے، اور بولے:

"کیا تُمھارے اندر اُلّوؤں کی رُوح داخل ہو گئی ہے؟ کتنی دیر سے اُلّو اُلّو کر رہے ہو۔ اُلّو کہیں کے۔ خاموشی سے سو جاؤ۔ ہم اپنے گھر میں نہیں، قید خانے میں ہیں۔"

"لیکن انکل، ہم نے اُلّو کی آواز سُنی تھی۔" آصف بولا۔

"کیا کہا؟ اُلّو کی آواز سُنی تھی؟ وہ بھی اس قید خانے

ہیں ؟ کیا تم سچ کہہ رہے ہو ؟" کامران مرزا نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔ ان کی آنکھیں ابھی تک بند تھیں۔

"اس قید خانے میں جھوٹ بول کر مجھے کیا ملے گا" آصف نے کہا۔

"ہاں۔ یہ بھی ٹھیک ہے" کامران مرزا نے حیران ہو کر کہا اور آنکھیں کھول دیں۔

اس سے پہلے آصف اور فرحت بھی آنکھیں کھول چکے تھے اور دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ آخر آفتاب کے منہ سے نکلا:

"بھئی پہرے دار، تم بھیس بدلنے میں بہت ماہر ہو" اچانک کامران مرزا نے ان تینوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ انھیں ڈر محسوس ہوا کہ کہیں وہ اور منور علی خان آپس میں بات چیت شروع نہ کر دیں۔

اب وہ دروازے پر آ کھڑے ہوئے۔ کامران مرزا نے اشاروں ہی اشاروں میں منور علی خان کو بتایا کہ یہاں جو بات بھی کی جاتی ہے، فوراً سن لی جاتی ہے۔ اس کے جواب میں منور علی خاں نے اشاروں میں پوچھا کہ پھر وہ بات کیسے کریں ؟ کامران مرزا نے انھیں طریقہ بتا دیا، لیکن ابھی وہ اس پر عمل بھی نہ

کر پائے تھے کہ ایک آواز نے ان سب کو چونکا دیا:

"ہاتھ اوپر اٹھا لو، ورنہ تمھارے ساتھ قید خانے کے اندر موجود یہ چاروں بھی ختم ہو جائیں گے"

منور علی خاں کے ہاتھ اوپر اٹھ گئے۔

جارج کے کمرے میں

"اُلّو ہے ہی منحوس پرندہ۔" آفتاب نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"غریب اُلّو پر غصّہ اُتارنے سے کیا فائدہ۔ اس نے ہمارا کیا بگاڑا ہے۔" آصف بولا۔

"ہم اسی کا ذکر تو کر رہے تھے کہ یہ مصیبت نازل ہوئی۔ اگر اس کا ذکر نہ کرتے تو اس وقت اُلّو کے بجائے اُستاد صاحب اور ان کے ساتھی ہاتھ اُٹھائے کھڑے ہوتے۔" آفتاب نے کہا۔

"خاموش رہو! ہر وقت بولنے کا مرض بُرا ہوتا ہے۔" اُستاد نے کہا۔

"اُستاد جی، کیا تم حکیم بھی ہو؟" فرحت نے کہا۔

"ناک میں دم کر دیا ہے تم لوگوں نے۔ جس دن سے یشوما تمھارے گھر میں گھسا تھا، اسی دن سے ہماری مصیبت آئی ہوئی ہے۔"

"اس میں ہمارا کیا قصور۔ یہ تو مصیبت کی غلطی ہے۔" آفتاب نے شانے اُچکائے۔

اُستاد کا ایک ساتھی مُنوّر علی خاں کی تلاشی لے چکا تھا۔ ان کا ریوالور، چاقو اور کمر سے بندھا ہوا دستی بموں والا تھیلا اب اس کے ہاتھ میں تھا۔

"بہت خوب! تو تم ان کے ساتھی ہو۔ جنگل میں تم ہی بلّیوں سے بھڑ گئے تھے اور پھر ہمارے ایک ساتھی کو بے ہوش کر کے اِدھر آ نکلے۔" اُستاد نے مُسکرا کر کہا۔

"اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو ضرور یہی بات ہو گی۔" مُنوّر علی خان نے کہا۔

"تب تو ٹھیک ہے۔ تم بھی ان کے ساتھ ہی رہو۔" یہ کہہ کر اُستاد نے کوٹھڑی کا تالا کھولا اور انھیں بھی اندر دھکّا دے دیا۔

"بھائی اُستاد، دھکّے تو نہ دو۔ کیا تم میں شرافت نہیں ہے؟" آفتاب نے جھلّا کر کہا۔

"نہیں۔ میرا خیال ہے، ان میں سے کسی کا نام شرافت نہیں ہے۔" آصف بولا۔

"اگر ہو گا بھی تو وہ پانی پینے چلا گیا ہو گا، تاکہ اس کے نام کو بٹّا نہ لگے۔"

اُستاد تالا لگا چکا تھا۔ تالے کو جھٹکا دیتے ہوئے وہ بولا:
"اب جس قدر جی چاہے باتیں کرتے رہو۔ کوئی تمھیں منع نہیں کرے گا۔ اُمید ہے کہ اس دنیا میں تمھارا یہ شوق اچھی طرح پُورا ہو جائے گا۔"
"کون سا شوق؟" آفتاب نے جلدی سے پُوچھا۔
"یہی، باتیں کرنے کا۔"
"اوہ! شکریہ۔ ویسے تم ایک بات بتا سکتے ہو؟"
"بکو" اس نے تلملا کر کہا۔
"تم کس چیز کے اُستاد ہو؟ تمھیں الجبرا آتا ہے؟ یہ فرحت الجبرے میں بہت کمزور ہے۔ کیا تم اسے الجبرے کی مشق کرا دو گے؛ تاکہ یہ اپنی دُنیا میں جا کر اس زمین دوز دُنیا کے اُستاد کی تعریف میں زمین آسمان ایک کر سکے؟"
"یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ تمھاری زبان اس دُنیا کی سب سے انوکھی چیز ہے، اور ہم اسے تمھاری گدّی سے نکال کر اپنے عجائب خانے میں سجائیں گے۔" اُستاد نے چِلّا کر کہا۔
"بہت بہت شکریہ۔ میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ تاہم میں اُمید کرتا ہوں کہ عجائب خانے میں اپنی زبان کو دیکھنے کی مجھے بھی اجازت

ہو گی۔" آفتاب نے کہا۔
"تمھیں تو سب سے پہلے سیر کرائیں گے۔" اُستاد نے پیر پٹخ کر کہا اور واپس جانے کے لیے مُڑ گیا۔ اس کے ساتھی بھی مُڑ گئے۔
"بہت بہت شکریہ، اُستاد۔ میں تمھارا یہ اِحسان زندگی بھر یاد رکھوں گا۔ خُدا تمھیں خُوش رکھے۔"
کامران مرزا اور دُوسرے مُسکراتے رہ گئے۔ اُستاد اور اس کے ساتھی ہال سے نکل کر جا چکے تھے۔
"تم بھی ہمارے ساتھ آ ہی ملے۔" ان کے جانے کے بعد کامران مرزا مُنوّر علی خان کی طرف مُڑے۔
"مجھے افسوس ہے؛ ہم نے جو سوچا تھا، وہ نہیں ہوا۔" وہ بولے۔
"پروا نہ کرو۔ ایسا بھی ہوتا ہے۔ در اصل ہمیں اس قسم کے کسی ٹھکانے کی اُمید نہ تھی۔ میرا تو خیال تھا کہ شہر میں ہی میں کوئی عمارت ہو گی۔ لیکن یہاں کی تو دُنیا ہی کچھ اور ہے۔ یہاں عجیب و غریب مشینیں لگی ہیں۔ اس دُنیا کا کرتا دھرتا ایک شخص جارج ہے۔ وہ اپنے کمرے میں مشینوں کے پاس بیٹھے بیٹھے سب کچھ کر لیتا ہے اور نہ صرف یہاں ہونے والی تمام گفت گو، بلکہ یہ جنگل سے آنے والی آوازیں

بھی صاف سُن لیتا ہے۔ جب تم بلّیوں سے لڑ رہے تھے تو اس وقت ہم سب ان کی آوازیں سُن رہے تھے۔"

"ارے! تو تم لوگوں کو یہ بات معلوم ہو چکی ہے؟"

"ہاں۔ نہ صرف یہ بلکہ یہ بھی معلوم ہے کہ تم ان کے ایک آدمی کو بے ہوش کر کے ان کے گھیرے سے نکل آئے ہو۔ لیکن ہم یہ نہیں جانتے کہ تم اندر کیسے داخل ہو گئے۔ کیا تمھیں خفیہ راستہ معلوم ہو گیا ہے؟"

"نہیں۔ اس آدمی کو بے ہوش کر کے میں عمارت تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ پھر وہ لوگ وہاں آئے، جو میری تلاش میں نکلے تھے۔ میں ان کے پیچھے اندر داخل ہو گیا۔"

"ہُوں! جو ہوا، اچھا ہوا۔"

"اور اب ہم صبح کو اس دنیا کی سیر کرنے نکلیں گے۔ آپ کے بغیر کیا لُطف آتا۔" آفتاب نے کہا۔

"جارج کیسا آدمی ہے، اور وہ کیا چاہتا ہے؟" مُنوّر علی خاں نے پُوچھا۔

"بہت نیک آدمی ہے، اور ہماری خیریّت نیک چاہتا ہے۔" آفتاب نے خوش ہو کر کہا۔ "اس نے ہمیں بے شان دار مہمان خانہ ہی عطا نہیں کیا، پُر تکلّف کھانا بھی کھلایا ہے۔ مگر آپ تو بھوکے ہوں گے۔"

"میری فکر نہ کرو۔ میں کئی دن تک بھوکا رہ سکتا ہوں۔"

"نہیں نہیں۔ جارج کے ہوتے ہوئے یہ نہیں ہو سکتا۔ اس نے ہمیں کھانا کافی مقدار میں بھیجا تھا۔ اس میں سے بہت سا بچ گیا ہے۔ میں ابھی آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔" آفتاب نے کہا اور کونے میں رکھی کھانے کی ٹرے اُٹھانے لگا۔

مُنوّر علی خاں واقعی بہت بھوکے تھے۔ اُنھوں نے روٹی کا لقمہ توڑا اور سالن لگا کر مُنھ میں رکھا۔ اچانک انھیں ہنسی آ گئی۔ دراصل وہ آفتاب کی باتوں کو سچ سمجھے تھے۔

"تو یہ ہے وہ پُر لُطف کھانا۔"

"شکر کیجیے، انکل۔ جارج چاہتا تو ہمیں اس کھانے سے بھی محروم کر سکتا تھا۔" آصف نے کہا۔

انھوں نے جیسے تیسے چند لقمے کھائے اور پھر ٹرے کھسکا دی۔

"میرا خیال ہے، اب صُبح تک ہمارے پاس کوئی کام کرنے کا نہیں رہ گیا، اس لیے کیوں نہ اب سو جائیں؟" مُنوّر علی خاں نے کہا۔

"بہت اچھا خیال ہے۔"

"لیکن بھئی، یہ تم لوگ خراٹے لینا کب سے سیکھ گئے ہو؟" مُنوّر علی خاں نے مُسکرا کر پُوچھا۔

"زندگی میں پہلی مرتبہ آج ہی خرّاٹے لیے تھے۔ دراصل ہم تجربہ کر کے دیکھ رہے تھے۔" آفتاب نے بتایا اور سب مسکراتے ہوئے لیٹ گئے۔

"آپ کے ساتھ جنگل میں کیا گزری؟ ذرا تفصیل سے بتائیے۔" فرحت نے کہا۔

اس پر منوّر علی خان انھیں ہر بات تفصیل سے سنانے لگے۔ پھر نہ جانے کب وہ نیند کی وادی میں چلے گئے۔

صبح ناشتے میں انھیں بغیر دودھ کی چائے اور بھنے ہوئے چنے دیے گئے۔ آفتاب نے بھنے ہوئے چنے بڑے شوق سے کھائے اور بے مزہ چائے چٹخارے لے لے کر پی۔ وہ ہر گھونٹ پر کہتا رہا:

"واہ کیا لذیذ چائے ہے! میں زندگی میں پہلی مرتبہ ایسی چائے پی رہا ہوں۔"

دوسرے منھ بنا بنا کر چنے کھاتے اور چائے پیتے رہے۔ رمضان انھیں پھر نظر نہیں آیا تھا۔ نہ جانے اس کی ڈیوٹی کہاں لگا دی گئی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ اس سے مل کر کچھ معلومات حاصل کریں، لیکن اب یہ بھی مشکل نظر آ رہا تھا۔

"دو تین سوال میرے ذہن میں چبھ رہے ہیں۔" آصف نے ناشتے کے بعد کہا۔

"سوال نہ ہوئے سوئیاں ہو گئے۔" آفتاب بول اٹھا۔

"خیر بتاؤ، وہ سوال کیا ہیں؟" فرحت نے پوچھا۔

"ان کے جوابات تو صرف جارج ہی دے سکے گا۔"

"تو پھر اسی سے پوچھنا۔ ہمارا دماغ کیوں چاٹ رہے ہو؟" فرحت بولی۔

"ہاں۔ کسی عقل مند آدمی کا دماغ چاٹو تو کچھ فائدہ بھی ہو۔" آفتاب نے کہا۔

"اور اس وقت اس زمین دوز دنیا میں آفتاب سے زیادہ عقل مند کون ہوگا۔ لہٰذا تم اسی کا دماغ چاٹو۔" فرحت نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"لو بھائی، شروع ہو گئیں ان کی باتیں۔" منوّر علی خاں ٹانگیں پھیلاتے ہوئے بولے۔

"تو انکل، آپ لوگ اپنی باتیں شروع کر لیں۔ آخر وقت تو گزارنا ہی ہے۔" آفتاب نے مسکرا کر کہا۔

"وقت تو خود بخود گزرتا ہے۔ اسے کوئی کیا گزارے گا۔" آصف نے فلسفیوں کے سے انداز میں کہا۔

"ذرا یہ تو سوچو، تمھاری باتیں جارج بھی سن رہا ہوگا۔

کچھ تو خیال کرو۔" آفتاب نے کہا۔

"سُن رہا ہوگا تو میں کیا کروں۔ اگر اُسے یہ باتیں ناگوار گزر رہی ہیں تو اپنے کان بند کر لے۔" آصف نے کہا۔

"کان بند کرنے کے بجائے وہ آلہ بھی تو بند کر سکتا ہے جس کے ذریعے ہماری باتیں سُنتا ہے۔" فرحت نے کہا۔

"لیکن اِس طرح وہ اُن باتوں کو سُننے سے محروم رہے گا، جو ہم اُس کے خلاف کریں گے۔"

"تو ہم اس کے خلاف کوئی بات نہیں کریں گے آخر ہمیں اب یہاں رہنا ہے۔ اور وہ تو تم نے سُنا ہی ہوگا کہ دریا میں رہنا ہے تو مگر مچھ سے کیا بیر۔" آصف بولا۔

"ہاں، یہ تو ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اس کے خلاف کوئی بات نہ کریں۔" آفتاب نے کہا۔

کامران مرزا اور مُنوّر علی خاں خاموشی سے مُسکرا رہے تھے۔ اسی وقت دروازے پر تین پہرے دار نمودار ہوئے۔ ان میں سے ایک نے کہا:

"تمھیں مسٹر جارج کے پاس چلنا ہے۔ ہم دروازہ کھول رہے ہیں۔ اگر کسی نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو اس کی سزا بھگتے گا۔"

ہم بہت اچھی طرح جانتے ہیں اور بہت دنوں سے بھگت رہے ہیں۔ اور ابھی نہ جانے کب تک بھگتنا پڑے۔ اس لیے ہمیں اس قسم کی ہدایت کرنے کی ضرورت نہیں۔ کسی نئے آدمی کو ہدایت کرتے ہوئے تم ضرور اچھے لگو گے۔" آفتاب نے بُرا سا مُنھ بنا کر کہا۔ پہرے دار دروازہ کھولنے لگا تھا۔ وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ کامران مرزا نے انھیں آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا کہ کوئی حرکت نہ کریں۔

دروازہ کھلنے پر وہ باہر نکل آئے، اور پہرے داروں کے آگے آگے برآمدے میں چلنے لگے۔ کامران مرزا ہر چیز کا بغور جائزہ لینے کے عادی تھے۔ اُن کی صحبت میں آفتاب اور آصف کو بھی یہی عادت ہو گئی تھی۔ برآمدوں میں سے گزرتے ہوئے اُنھوں نے کمروں کی تعداد ذہن نشین کر لی۔ جب وہ جارج کے کمرے کے دروازے پر پہنچے تو انھیں یہ معلوم ہو چکا تھا کہ اس کے کمرے کا نمبر کتنا ہے۔ دراصل یہاں جتنے بھی کمرے تھے، ان سب کے دروازے بالکل ایک جیسے تھے۔ ان پر ایک ہی رنگ کیا گیا تھا اور وہ تھا سیاہ۔ اس لیے یہ جاننا مشکل تھا کہ کون سا کمرا کس کا ہے۔ یہاں کے رہنے والے بھی صرف اپنے ہی کمرے کے متعلق جانتے تھے۔ اس کے علاوہ انھیں یہ معلوم نہیں

تھا کہ کون سا کمرا کس کا ہے۔

ایک پہرے دار نے ایک دروازے پر دو بار دستک دی۔ اندر سے آواز آئی:

"دروازہ کھلا ہے۔ اندر چلے آؤ۔"

وہ اندر داخل ہوئے۔ جارج اپنی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر نیلے رنگ کی کچھ دھاریاں سی پڑ گئی تھیں۔ انھوں نے ان دھاریوں کو حیرت سے دیکھا۔ آفتاب سے رہا نہ گیا پوچھ ہی بیٹھا:

"یہ تم نے اپنے منھ پر نیلی لکیریں کیوں بنا لی ہیں؟"

"میں نے یہاں تمھیں اس لیے بلایا ہے کہ تم پر واضح کر دوں کہ یہاں کام کس طرح ہوتا ہے، کیوں کہ تمھیں بھی اب کام کرنا ہے۔"

"واضح کرو۔" آفتاب نے کہا۔

"لڑکے! تم اب نہ بولنا۔ میں کل بھی تمھاری بے پر کی سنتا رہا ہوں۔ میرے غصّے کو آواز نہ دو۔"

"بہت بہتر۔" آفتاب نے قدرے سہم کر کہا اور ہونٹ مضبوطی سے بند کر لیے۔

اسی وقت دروازے پر دو بار دستک ہوئی۔ جارج نے کہا "دروازہ کھلا ہے۔ چلے آؤ۔"

دروازہ کھلا۔ اُستاد اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے چار آدمی اور اندر آئے۔ اُنھوں نے ایک آدمی کو پکڑ رکھا تھا۔ سب نے چونک کر اسے دیکھا۔

یہ وہی پہرے دار تھا جس سے آفتاب ٹکرایا تھا اور اس کی جیب سے چابی نکال لی تھی۔

ایک منٹ کُرسی پر

"اِسے اچھے موقع پر لائے ہو۔ ان لوگوں کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ یہاں معمولی سی غلطی کی سزا کس قدر بھیانک ملتی ہے۔" جارج نے پہرے دار کو دیکھتے ہوئے کہا پھر بڑبڑایا "مگر حیرت ہے، چابی کہاں چلی گئی؟ اگر ان لوگوں نے اُڑائی ہوتی تو تلاشی کے دوران میں ضرور مل جاتی۔ قید خانے میں تو کوئی ایسی جگہ ہے ہی نہیں کہ یہ لوگ چابی وہاں چھپا سکتے۔ خیر، اس کو سزا ملنے کے بعد چابی تلاش کی جائے گی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی باغی نے اس کی جیب سے اُڑا لی ہو؟"

"جناب، وہ اس چابی سے کیا فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ زیادہ سے زیادہ وہ قید خانے سے باہر نکل جائے گا۔ اس کے بعد وہ کیا کرے گا؟ یہاں سے باہر تو نہیں نکل سکے گا۔" اُستاد نے کہا۔

"یہی سوال مجھے اُلجھن میں ڈال رہا ہے۔ ٹھہرو! ان

لوگوں کی ایک بار پھر تلاشی لو۔" جارج نے اچانک کہا۔

کامران مرزا، آفتاب، آصف اور فرحت پُرسکون انداز میں کھڑے رہے۔ البتہ مُنوّر علی خاں ضرور حیران تھے کیوں کہ انھیں چابی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔

اُستاد کے دو ساتھی آگے بڑھے اور ایک بار پھر ان لوگوں کی تلاشی لینے لگے، لیکن کسی کا خیال آفتاب کی طرف نہیں گیا۔ چابی نہ ملی تو جارج نے کہا:

"اب جاکر ان کے قید خانے کی تلاشی لو۔ ہو سکتا ہے اِنھوں نے کوئی جگہ بنا لی ہو۔"

یہ سُن کر اُستاد نے دو آدمیوں کو اِشارہ کیا اور جارج کے کمرے سے نکل گئے۔

"اب ہم ذرا اس سے نپٹ لیں۔ بہرحال، یہ قصور اس کا ہے۔ چابی اس کی جیب سے گری ہے یا کسی نے نکالی ہے، دونوں صورتوں میں قصوروار یہ ہے۔ میں اسے صرف ایک منٹ کی سزا دیتا ہوں۔ چلو، کُرسی نمبر دس پر بیٹھ جاؤ۔" جارج نے پہرے دار سے کہا۔

"رحم کیجیے جناب، خُدا کے لیے۔ میں یہ سزا برداشت نہیں کر سکوں گا۔"

"مجھے افسوس ہے، میں نے آج تک اس سے کم سزا

کسی کو نہیں دی۔"

پہرے دار کے مُنہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔ وہ چُپ چاپ کُرسی نمبر دس کی طرف قدم بڑھانے لگا۔ اس کی ٹانگیں تھرتھر کانپ رہی تھیں، چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ یُوں لگتا تھا جیسے کُرسی تک پُہنچنے سے پہلے ہی فرش پر گر جائے گا۔ آخرکار وہ کُرسی تک پُہنچ گیا۔ اِتنی دیر میں جارج کُرسی کو ایک منٹ پر سیٹ کر چکا تھا۔ پہرے دار کے کُرسی پر بیٹھنے کے بعد اس نے کہا:

"کُرسی کے دائیں بازو پر لگا ہوا بٹن دباؤ۔"

پہرے دار کی اُنگلی آپ ہی آپ بٹن پر چلی گئی۔

دُوسرے ہی لمحے اُن کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ پہرے دار کا جسم پارے کی طرح حرکت کرنے لگا تھا۔ اس کے مُنہ سے خوف ناک چیخیں نکل رہی تھیں۔ ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ان کا جی چاہا کہ وہ دوڑ کر جائیں اور اسے اس کُرسی سے نجات دلا دیں۔ مگر یہ ان کے بس سے باہر تھا۔ آفتاب نے بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابُو پایا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ جارج کو بتا دے، میں نے اس بدنصیب پہرے دار کی جیب سے چابی نکالی تھی، اور وہ اب بھی میرے پاس ہے۔ لیکن وہ خاموش رہا۔ اس نے

یہ کہہ کر اپنے دِل کو سمجھا لیا کہ یہ لوگ وطن دشمن ہیں۔ جسے سزا مِل رہی ہے وہ بھی ان کا ساتھی ہے۔

ایک منٹ تک یہی کیفیّت رہی۔ سب کے چہرے تنے رہے۔ سانس تیز تیز چلتے رہے اور کُرسی پر بیٹھا ہوا شخص اس طرح تڑپتا رہا جیسے کسی مُرغ کو تھوڑا سا ذبح کر کے چھوڑ دیا جائے، یا پھر جیسے مچھلی بغیر پانی کے تڑپتی ہے۔

آخر خُدا خُدا کر کے ایک منٹ پُورا ہوا۔ پہرے دار کی حالت مُردوں جیسی ہو گئی تھی، گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی تھی اور چہرے پر نیلی نیلی دھاریاں پڑ گئی تھیں۔ وہ یہ دیکھ کر چونک اُٹھے کہ ان دھاریوں اور جارج کے چہرے پر نظر آنے والی دھاریوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ وہ یہ سوچے بغیر نہ رہ سکے، تو کیا جارج کو بھی کُرسی پر بیٹھنا پڑا ہے؟

"اب اگر تم کوئی سوال کرنا چاہو تو بڑے شوق سے کر سکتے ہو۔ اس کے بعد تمھیں یہاں کی سیر کرائی جائے گی۔" جارج نے ان کی طرف مُڑ کر کہا۔

اُستاد کے دو ساتھی پہرے دار کو کُرسی سے اُٹھا کر ہال سے باہر لے جا رہے تھے۔ اس کے قدم اُلٹے سیدھے

فرش پر پڑ رہے تھے اور اس کے مُنھ سے ابھی تک سسکیاں نکل رہی تھیں۔

"ہم چند سوال کرنا تو چاہتے ہیں بشرطے کہ تم جواب دینا پسند کرو۔" آصف بولا۔

"ضرور جواب دُوں گا کیوں کہ تم ہمارے بہت کام آسکتے ہو۔"

"تمھاری مہربانی ہے۔ کیا یہ بتانا پسند کرو گے کہ تمھارے چہرے پر بھی ایسی ہی نیلی دھاریاں کیوں نظر آ رہی ہیں جیسی پہرے دار کے چہرے پر ہیں؟" آصف نے سوال کیا۔

جارج کا چہرہ تن گیا۔ پھر اس نے خُود پر قابُو پاتے ہوئے کہا "اس جگہ غلطی کسی سے بھی ہو، اسے سزا ضرور ملتی ہے۔ مجھ سے رات یہ غلطی ہوئی کہ میں نے اُسے تمھارے اس ساتھی کے بارے میں رپورٹ نہیں دی تھی۔ دراصل مجھے یہ بات معلوم نہ تھی کہ اس کمرے میں ہونے والی تمام گفت گو سے وہ بھی باخبر رہتا ہے۔ یہ بات مجھے کل ہی معلوم ہوئی، لیکن وقت گزر چکا تھا۔ مجھ سے غلطی ہو چکی تھی۔ لہٰذا مجھے بھی سزا دی گئی۔"

"اوہ! اب بات سمجھ میں آئی۔ اچھا، یہ بتا دو کہ یشوما کو گرفتار کرنے کے لیے جن چھ آدمیوں کو بھیجا گیا تھا،

اُن کے انگوٹھوں میں چھلّے تھے۔ اُنھوں نے کہا تھا کہ ان چھلّوں میں سُرخ موت قید ہے۔ کیا یہ بات صحیح ہے؟"

"اس میں کوئی شک نہیں۔" جارج نے کہا۔

"تب پھر وہ چھلّے اور لوگوں کے انگوٹھوں میں نظر کیوں نہیں آتے؟ اس کے ساتھ ہی ان لوگوں میں سے تین کے پاس سے وہ شیشیاں اور سُنہری مائل نیلی ڈبیاں بھی برآمد ہوئی تھیں۔ یہ چیزیں بھی کسی اور کے پاس نظر نہیں آئیں۔ کیا تم اس کی وجہ بتا سکتے ہو اور یہ بھی کہ وہ چیزیں کیا بلا ہیں؟"

"جب کسی کو خاص مُہم پر روانہ کیا جاتا ہے تو اسے وہ چھلّا، شیشی اور ڈبیا دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ننھے تیر بھی دیے جاتے ہیں۔ یشوما کو گرفتار کرنا ایک اہم کام تھا۔ اس لیے ان چھ کو یہ چیزیں دی گئیں، اور جب وہ گرفتار ہو گئے تو اُنھیں صرف ان چھلّوں کی وجہ سے ہی چھڑایا گیا، اور باقی چیزیں حاصل کرنے کے لیے کچھ اور لوگوں کو تمھاری طرف بھیجا گیا۔ لیکن ان کو چھلّے نہیں دیے گئے تھے، اور نہ دُوسری چیزیں۔ ان کے پاس صرف گیس پستول تھے۔ رہ گیا یہ سوال کہ یہ چیزیں کیا بلا ہیں تو ان کے بارے میں تمھیں کچھ نہیں بتایا جا سکتا۔" جارج یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"تم بھول رہے ہو کہ نمبر نو کی لاش ہمارے قبضے میں تھی۔ اس کی لاش سے وہ چھلا ضرور اُتار لیا گیا ہو گا، اور وہ ہمیں مل جائے گا۔"

"ہم نہیں، تم بھول رہے ہو۔ نمبر نو کا چھلا اُسی وقت اُڑا لیا گیا تھا۔"

وہ یہ سُن کر بھونچکا رہ گئے۔ کامران مرزا کو بھی اب یاد آیا کہ وہ نمبر نو کی لاش سے اُتارے جانے والے چھلے کے بارے میں دریافت کرنا بھول گئے تھے، اور جن لوگوں نے لاش کا پوسٹ مارٹم کیا تھا نہ تو اُنھوں نے چھلے کا کوئی ذکر کیا تھا نہ انسپکٹر ریاض نے اس بارے میں کچھ کہا تھا۔

"خیر، کوئی بات نہیں۔ ہمیں اس چھلے کا کرنا ہی کیا ہے۔ ہاں، فرحت کے ضرور کام آسکتا تھا۔" آفتاب نے کہا۔

"مجھے چھلے پہننے کا کوئی شوق نہیں۔" فرحت نے منھ بنا کر کہا۔

"تب تو وہ ہمارے لیے بالکل ہی بے کار تھا۔" آصف نے خوش ہو کر کہا۔

"ہاں، مسٹر جارج۔ تم نے اچھا کیا کہ اُسے اُڑا لیا۔" آفتاب بولا۔

"بس۔ اب تمھیں اور کوئی سوال نہیں کرنا ہے۔ اس لیے سیر کے لیے جا سکتے ہو۔ اُستاد، انھیں اچھی طرح گھما پھرا کر قید خانے میں پہنچا دینا۔ ہم ان کے بارے میں کل فیصلہ کریں گے۔"

"جی، بہت اچھا۔" اُستاد نے کہا اور انھیں چلنے کا اشارہ کیا۔

"ایک منٹ۔" آفتاب کو اچانک کوئی خیال آ گیا۔ جارج نے اس کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا تو وہ بولا:

"کیا ہم یہاں کام کرنے والوں سے، سیر کے دوران میں، بات چیت کر سکتے ہیں؟"

"بڑے شوق سے۔ میرے آدمی کوئی اعتراض نہیں کریں گے۔"

"بہت بہت شکریہ۔ تم بہت فراخ دل میزبان ہو۔ تم نے رات نہایت شاندار کھانا کھلایا تھا، اور صبح کا ناشتا تو لاجواب تھا۔"

"آیندہ تمھیں اس سے بھی اچھی اچھی چیزیں ملیں گی۔" جارج نے مسکرا کر کہا۔

"بھئی واہ! پھر تو ہمارے مزے ہو جائیں گے۔" آفتاب خوش ہو کر بولا۔

وہ سب خاموشی سے دروازے کی طرف چل پڑے۔ آفتاب سب کے بعد جانے کے لیے مڑا، لیکن پھر رُک گیا

اور جارج کی طرف مڑتے ہوئے بولا:

"معاف کرنا۔ ایک سوال رہ گیا ہے۔"

"حد ہو گئی۔ چلو بتاؤ۔ کیا بات ہے؟" اس نے جھلّا کر کہا۔

"وہ چھلّے اور دُوسری چیزیں کون دیتا ہے؟"

"میں دیتا ہوں۔ اس کمرے میں ایسی چیزیں بھاری تعداد میں موجُود ہیں۔ یہ دیکھو۔" یہ کہہ کر اس نے دیوار میں سے ایک دراز کھینچی۔ ساتھ ہی چند درازیں اور کھینچیں۔ وہ یہ دیکھ کر دم بخُود رہ گئے کہ ساری درازیں گیس پستولوں، ننھے تیروں، سُرخ موت والے چھلّوں، شیشیوں اور ڈبیوں سے بھری پڑی تھیں۔

زمین دوز دُنیا کی سیر

کامران مرزا نے آفتاب کو اِشارہ کیا کہ اب خاموش رہو۔ تم نے کافی کام کی باتیں معلُوم کر لی ہیں۔ وہ اُستاد اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ ہال سے باہر نکل آئے۔ انھیں سب سے پہلے ایک کمرے کے دروازے پر لایا گیا جو بند تھا۔ اُستاد نے وہاں پُہنچ کر دروازے کے اُوپر لگے بٹن کو تین بار دبایا۔ کسی نے اندر سے پُوچھا:

"کون ہے؟"

"اُستاد۔" اس نے بڑے رُعب سے کہا۔

دروازہ فوراً کھُل گیا۔ وہ اندر داخل ہوئے۔ یہ ایک بہت بڑا ہال تھا۔ لمبائی، چوڑائی سے زیادہ تھی۔ ہال کے بیچوں بیچ ایک بہت بڑی مشین لگی تھی۔ اس مشین پر پچّیس آدمی کام کر رہے تھے۔ دروازہ جس شخص نے کھولا تھا، اس کے ہاتھ میں گیس پستول تھا۔

"صرف ایک آدمی ان پچّیس آدمیوں کو کنٹرول کرتا ہے۔"

اُستاد نے بتایا۔ "اور وہ بھی صرف ایک گیس پستول سے، کیونکہ ان لوگوں کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ صرف ایک گیس پستول سے یہ پچیس کے پچیس آدمی ختم ہو سکتے ہیں۔ اس لیے یہ کوئی غلط حرکت کرنے کی جرأت تک نہیں کرتے۔"

"اس مشین پر کیا تیار ہوتا ہے؟" آفتاب نے پوچھا۔

"آگے بڑھ کر دیکھ سکتے ہو۔ تمھیں اجازت ہے۔ ہم دروازے پر کھڑے ہیں۔" اُستاد نے کہا۔

وہ آگے بڑھ گئے۔ دوسرے ہی لمحے ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اِس مشین پر گیس پستول تیار ہو رہے تھے۔ آفتاب نے آگے بڑھ کر ایک پستول اُٹھالیا اور اسے اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ پھر اسے آصف کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے دیکھنے کے بعد فرحت کو دیا۔ اسی طرح ہر ایک نے کیا۔

"تم لوگ ان پستولوں سے دروازے پر کھڑے پہرے دار کو ختم کیوں نہیں کر دیتے۔" آفتاب نے ایک مزدور سے پوچھا۔

"ان لوگوں پر گیس پستول اثر نہیں کرتا۔ ویسے اگر ہم پہرے دار کو ختم کر کے باہر نکل بھی جائیں تو اس سے کیا ہو گا۔ ہم کیا جانیں اِس زمین دوز دُنیا سے باہر کیسے نکلا جا سکتا ہے۔"

"ہوں۔ تم یہاں تک کیسے پہنچے؟ میرا مطلب ہے، کیا یہ کام تم نے اپنی خوشی سے کیا ہے؟" آصف نے پوچھا۔

"اس قسم کے کام کوئی اپنی مرضی سے بھی کرتا ہے؟ میں تو اپنے گھر سے اپنی چھوٹی بچی کے لیے دودھ لینے نکلا تھا کہ ایک کار میرے پاس آ کر رکی اور اس میں بیٹھے ایک آدمی نے مجھ سے کسی کا پتا پوچھنا شروع کیا۔ اسی وقت کسی نے پیچھے سے میری ناک پر کوئی چیز لگا دی۔ میں ایک دم بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو یہاں تھا۔ مجھے تو یہ بھی یاد نہیں کہ کتنے سال ہو گئے ہیں۔ میرے تین بچے ہیں، ایک بوڑھی ماں ہے، بیوی ہے۔ نہ جانے میرے بعد ان کا کیا حال ہوا ہو گا۔ وہ زندہ بھی ہوں گے یا نہیں۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اس کی ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔

"فکر نہ کرو۔ ہم تمھیں ضرور چھڑا لے جائیں گے۔ اچھا، یہ بتاؤ، رات کو تم لوگ کہاں سوتے ہو؟"

"ایک بہت بڑا کمرا ہے۔ یہاں جتنے بھی کام کرنے والے ہیں، سب وہیں سوتے ہیں۔ تقریباً اڑھائی سو لوگ ہیں۔ سب کے سب اس کمرے میں بند کر دیے جاتے ہیں۔"

"باہر کتنے آدمی پہرا دیتے ہیں؟"

"پہرا دینے کی ضرورت نہیں۔ دروازہ تو صرف باہر سے کھل سکتا ہے۔ یوں بھی رات کو باہر نکلنے کی کسی کو اجازت نہیں ہے۔ جو لوگ ان کے وفادار ہیں، وہ بھی باہر نہیں نکل سکتے۔"

"وفادار لوگ کہاں سوتے ہیں؟"

"ان کے لیے الگ کمرے ہیں۔"

"اُن کے کمرے باہر سے کھل سکتے ہیں؟"

"معلوم نہیں۔ ہم تو اندر بند ہوتے ہیں۔"

"وفادار لوگوں کی تعداد کتنی ہے؟"

"تقریباً پچاس آدمی ہیں۔" اس نے بتایا۔

"اُن کو بھی رات کے وقت اپنے کمروں سے نکلنے کی اجازت نہیں؟"

"نہیں، جب تک جارج کی طرف سے حکم نہ ملے۔ البتہ جارج رات کے وقت بھی اپنے کمرے سے نکل سکتا ہے۔ صرف اس کا سونے کا کمرا ایسا ہے کہ جب وہ اندر سے بند کر لیتا ہے تو باہر سے نہیں کھل سکتا۔"

"اگر کسی طرح تمھارے یہاں سے نکل جانے کا انتظام کر دیا جائے تو کیا تم جانا پسند کرو گے؟" آصف نے پوچھا۔

"ایسا کون نہ چاہے گا۔ مگر یہ ناممکن ہے۔"

"یہی تمھاری سب سے بڑی غلطی ہے۔ تم خدا کی مدد پر ایمان نہیں رکھتے۔ یاد رکھو، اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور اس کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں۔ اِنشاء اللہ بہت جلد تم یہاں سے نکل کر اپنے گھروں کو جا سکو گے۔" کامران مرزا بولے۔

"ہم تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"فکر نہ کرو۔ کیا باقی لوگوں کی کہانی بھی تم سے ملتی جلتی ہے؟"

"ہاں۔ تقریباً ایک جیسی کہانی ہر ایک کی ہے۔ یہ سب لوگ اپنے ماں، باپ، بہن، بھائیوں، بیوی، بچوں کو یاد کر کر کے روتے ہیں، مگر ان لوگوں کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔"

"ہوں۔ کیا تمھیں اندازہ ہے کہ یہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟"

"یہ شاید کسی کو بھی معلوم نہیں۔ جارج کو بھی نہیں پتا۔ صرف وہ جانتا ہے جو ان سے سینکڑوں میل دُور بیٹھ کر بھی ان کو کنٹرول کرتا ہے۔ وہ کوئی بہت خوف ناک شخص ہے۔ یہ سب اس سے کانپتے ہیں۔ جارج تک کی جان

جاتی ہے۔ یہ لوگ سوچ بھی نہیں سکتے کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ کیوں کہ اُس کا حُکم ہے کہ ایسا سوچو بھی نہیں۔"

"اچھا، شکریہ۔ اِنشاء اللہ ہم بہت جلد دوبارہ ملیں گے۔" کامران مرزا نے کہا اور آگے بڑھ گئے۔ اُنھوں نے کچھ اور لوگوں سے بھی سوالات کیے، لیکن سب نے اِسی قسم کی باتیں بتائیں۔ آخر وہ دروازے کی طرف بڑھے اور کامران مرزا نے اُستاد سے کہا:

"ہم یہاں کی سیر کر چکے ہیں۔ اب ہمیں جہاں لے جانا ہے، لے چلو۔"

"ٹھیک ہے۔ آؤ، لیکن کان کھول کر سُن لو۔ تم ان لوگوں کو تو یہاں سے کیا نکال لے جاؤ گے، خُود بھی یہاں سے نکل کر نہ جا سکو گے۔"

"ارے اُستاد۔ تم تو یُوں ہی فِکر کر رہے ہو۔ میں تو ان غریبوں کا دِل خوش کر رہا تھا۔ میں جانتا ہوں، یہاں سے نکل کر جانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔" کامران مرزا نے مُسکرا کر کہا۔

"ٹھیک ہے، چلو۔"

وہ وہاں سے نکل کر ایک اور ہال میں داخل ہوئے۔ یہاں بھی انھیں وہی حال نظر آیا۔ ہال کے بیچوں بیچ مشین

لگی تھی۔ اس پر بھی پچیّس آدمی کام کر رہے تھے۔ انھوں نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ یہاں مشین گنیں تیار کی جا رہی تھیں۔ اس مشین پر کام کرنے والوں سے سوالات کرنے پر اُن کی معلومات میں کوئی اضافہ نہ ہوا۔ اُنھوں نے بھی وہی باتیں بتائیں۔ یہ بھی مایُوس تھے اور باہر کی دُنیا میں جانے کا خیال تک نہ کر سکتے تھے۔ آفتاب، آصف اور فرحت نے ان سے بھی اِسی قسم کی باتیں کیں اور انھیں دلاسا دے کر باہر نکل آئے۔

ایک ہال میں انھیں مشین گنوں کی گولیاں بنتی نظر آئیں۔ ایک اور مشین پر گیس پستولوں کے لیے گیس تیار ہو رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ یہ گیس لوہے کے سلنڈروں میں محفُوظ کر لی جاتی ہے۔ ان سلنڈروں میں سے پستولوں میں گیس بھرنے کا کام جارج کو خود کرنا پڑتا ہے کیوں کہ اس کا طریقہ صرف اِسی کو معلوم ہے۔ اس لیے اس کے کمرے میں گیس کے سلنڈر موجُود رہتے ہیں۔

ان کے عِلاوہ کئی کمروں میں انھیں سائنسی آلات بنانے کی مشینیں نظر آئیں۔ ایک مشین پر ایسی نلکیاں تیّار ہو رہی تھیں جن میں تیر رکھ کر چلائے جاتے تھے۔

ان سب کے ذہنوں میں بار بار یہ سوال اُبھر رہا تھا کہ

"کیا یہ لوگ کسی جنگ کی تیاری میں مصروف ہیں؟"

آخر آفتاب نے یہ سوال کامران مرزا سے کر ہی دیا۔ ان کے جواب نے ان سب کو اور بھی اُلجھن میں مبتلا کر دیا۔ اُنھوں نے کہا تھا:

"جنگ پچاس آدمیوں سے نہیں لڑی جاتی۔ یہ کوئی اور چکّر ہے جو ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آ سکا۔ تاہم حالات بتاتے ہیں کہ کوئی بہت ہی خوف ناک دماغ اس سازش کے پیچھے کام کر رہا ہے۔ یشوما کچھ ضرور جانتا تھا۔ کسی نے اسے اصل بات بتا کر یہاں سے فرار ہونے میں مدد دی تھی، لیکن وہ کیا بتانا چاہتا تھا؛ میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا۔"

اب وہ اس سیر سے اُکتا چکے تھے اور بُری طرح تھک گئے تھے۔ شاید جارج بھی یہی چاہتا تھا کہ انھیں ذہنی طور پر شکست خوردہ بنا دیا جائے تاکہ یہ لوگ بھی ان کے لیے کام کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ وہ اس کمرے کو بھی دیکھ چکے تھے جس میں قیدی سوتے تھے۔ جارج کے وفادار جن کمروں میں سوتے تھے، انھیں وہ بھی دکھائے گئے تھے۔ یہ بہت آرام دہ تھے۔

انھیں مزدور قیدیوں پر بہت ترس آیا۔ آفتاب نے کہا:

"کاش! ہم بھی گیس پستولوں سے محفوظ رہ سکتے۔"

"پھر کیا ہوتا؟ ان کے پاس اور بھی تو ہتھیار ہیں۔" آصف نے کہا۔

"بھئی میں نے تو یوں ہی ایک بات کہہ دی ہے۔ خاموشی بڑھتی جا رہی تھی۔"

"اور خاموشی کو ختم کرنے کے تو تم ماہر ہو۔"

"چلو، کسی کام میں تو ماہر ہوں۔ تمھاری طرح ہر کام میں اناڑی تو نہیں ہوں۔" آفتاب نے کہا۔

اس سیر کا خاتمہ ان کے قید خانے پر ہوا۔ اُستاد نے وہاں آکر کہا تھا "اور یہ تمھارا قید خانہ ہے۔ اس کی بھی سیر کر لو۔" یہ کہتے وقت وہ مسکرایا تھا۔

"شکریہ، اُستاد۔ اس کی سیر تو ہم پہلے ہی کر چکے ہیں۔ ویسے اگر تم کہتے ہو تو دوبارہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔" آفتاب نے خوش دلی سے کہا اور سب سے پہلے کوٹھڑی میں داخل ہو گیا۔ اس کے پیچھے دوسرے بھی اندر آ گئے اور دروازہ بند کر دیا گیا۔ اُستاد نے جاتے ہوئے کہا:

"اب کل ملاقات ہو گی۔"

"ٹھیک ہے۔ کل تم سے مل کر ہمیں بہت خوشی ہو گی، اور یقیناً تمھیں بھی ہو گی۔" آفتاب نے ہاتھ ہلا کر اس انداز میں رخصتی اشارہ کیا جیسے وہ ان کا بہت گہرا

دوست ہو۔ وہ سب مُسکرا کر رہ گئے۔

ان کے جانے کے بعد کامران مرزا نے اشاروں میں ان سے کہا "اب ہمیں یہ سوچنا ہے کہ ہم کیا کریں؟ یہاں سے نکلنے کی کوئی ایسی ترکیب سوچنی ہے جس پر عمل کر کے ہم ان مظلوم لوگوں کو یہاں سے نکال لے جانے میں کامیاب ہو جائیں۔"

وہ سب کوئی ایسی ترکیب سوچنے میں محو ہو گئے۔

پُوری رات گزر چکی تھی، لیکن کامران مرزا کی طرف سے وزیرِ داخلہ اور سیکرٹری صاحب کو کوئی پیغام موصول نہ ہوا تھا، حال آں کہ کامران مرزا نے ان سے کہہ دیا تھا کہ وہ چیزیں لے کر پروفیسر جیلانی کے ہاں جائیں گے اور انھیں یقین ہے کہ دُشمن انھیں راستے میں روکیں گے۔ کار کے خانے میں اُنھوں نے ایسی رکاوٹ ڈال دی ہے کہ وہ کسی بھی چابی سے نہیں کُھلے گا۔ اس لیے دُشمن انھیں اپنے ٹھکانے پر ضرور لے جائیں گے۔ اُنھیں اُمید ہے کہ وہ ضرور وہاں سے فتح یاب لوٹیں گے اور واپس آتے ہی ان لوگوں کو فون پر اِطلاع دیں گے۔ رات گزرنے پر بھی کامران مرزا کا فون موصول نہ ہوا تو یہ دونوں حضرات بے چین ہو

گئے۔ سب سے پہلے سیکرٹری صاحب نے وزیرِ داخلہ کو فون کیا اور پھر کامران مرزا کے گھر۔ وہاں سے فضلو نے بتایا کہ وہ لوگ ابھی تک نہیں لوٹے۔

اب تو دونوں بہت پریشان ہوئے۔ وزیرِ داخلہ نے سیکرٹری صاحب کو اپنے دفتر ہی طلب کر لیا۔ وہاں محکمۂ سُراغ رسانی کے بڑے افسر بھی پہنچ گئے۔ وزیرِ داخلہ نے تمام معاملہ اُن کے سامنے رکھا طے ہوا کہ پُورے مُلک میں کامران مرزا اور ان کے ساتھیوں کی تلاش کی جائے۔ چُناں چہ اسی وقت وائرلیس کے ذریعے ہر پولیس سٹیشن سے رابطہ قائم کیا گیا۔ دُوسرے شہروں کو بھی پیغام جاری کیے گئے۔ کامران مرزا اور اُن کے ساتھیوں کا حلیہ بتایا گیا۔ صرف ایک گھنٹے بعد پُورے مُلک کی پولیس ان لوگوں کی تلاش میں سرگرداں ہو گئی۔ مجرموں کے ٹھکانوں پر اچانک چھاپے مارے گئے۔ ہوٹلوں کو بھی چھان مارا گیا۔ جنگلوں اور صحراؤں کو کھنگالا گیا۔ سمندر میں بھی دُور دُور تک آبدوزیں دوڑائی گئیں، لیکن کامران مرزا اور اُن کے ساتھیوں کا کوئی سُراغ نہ ملا۔

دوپہر کے وقت بھی انھیں وہی کھانا دیا گیا۔ آفتاب نے چٹخارے لے لے کر کھایا۔ البتہ دُوسرے منھ بنا بنا کر

کھاتے رہے۔ کھانے کے دوران میں کامران مرزا نے اِشاروں میں بات چیت کا سِلسِلہ پھر شُروع کیا:

"معلوم ہوتا ہے، تم ابھی تک کوئی ترکیب نہیں سوچ سکے۔"

اُنھوں نے نفی میں سر ہلائے۔ آفتاب نے مُسکراتے ہوئے سب کے سروں کی طرف اِشارہ کر کے کہا:

"شاید یہاں آکر ہمارے دماغوں کو زنگ لگ گیا ہے۔"

"زنگ تو لوہے کو لگتا ہے، اور ہمارے دماغ لوہے کے نہیں البتہ یہ دروازہ ضرور لوہے کا ہے۔" آصف نے سلاخوں والے دروازے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"تب پھر دماغ پر زور دو۔ کوئی تدبیر سوچو۔ کیا باقی زندگی اِسی دُنیا میں گزارنے کی ٹھان لی ہے؟"

"نظر تو یہی آرہا ہے۔" فرحت نے کہا۔

"ابّا جان، آپ اس چابی کو کیوں بھول رہے ہیں۔" آفتاب نے کہا۔

"میں بھولا نہیں ہوں۔ مجھے سب کچھ یاد ہے۔ دراصل ہمیں خطرہ مول لینا ہی پڑے گا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ترکیب میں نے سوچ لی ہے۔ تم سب کو اس پر عمل کرنا ہے۔ اگر ہم میں سے کسی ایک سے ذرا سی

بھی چُوک ہو گئی تو پھر ہمارے لیے یہاں سے نکلنا مشکل ہو جائے گا۔"

"لیکن اِشاروں میں ترکیب بتانا بہت مشکل ہو گا۔ ایسا نہ ہو ہم میں سے کوئی غلط سمجھ جائے۔" مُنوّر علی خاں نے کہا۔

"ہاں۔ یہ بھی ٹھیک ہے لیکن میں نے اس کا طریقہ بھی سوچ لیا ہے۔ رات ہونے پر میں تُم میں سے ہر ایک کے کان پر مُنھ رکھ کر پُوری سکیم بتاؤں گا۔"

ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ کامران مرزا ٹھیک کہہ رہے تھے۔ یہ بات ان کے ذہن میں نہیں آئی تھی۔ اب انھیں قدرے اِطمینان ہوا۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد وہ لیٹ گئے، اور زور زور سے خرّاٹے لینے لگے۔ خرّاٹوں کی گونج میں کامران مرزا باری باری ان میں سے ہر ایک کے کان پر مُنھ لگا کر اپنی ترکیب بتا رہے تھے۔ جارج کے فرشتوں کو بھی اس کا پتا نہ چل سکتا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھا اُن کی گفتگو سُننے کی کوشش بھی کر رہا ہوگا تو اسے خرّاٹوں کے سوا کچھ سُنائی نہیں دیا ہو گا۔

کامران مرزا نے اُنھیں کیا ترکیب بتائی؟ کیا وہ اس پر

عمل کر سکے ؟
مظلوم قیدیوں پہ کیا گزری؟
پروفیسر جیلانی سے ایک دلچسپ ملاقات۔
"ابھی دشمن کا پہلا قلعہ فتح ہوا ہے۔" کامران مرزا کا بیان۔
"مجھ پر گیس پستول سے فائر کرو۔" کامران مرزا آفتاب کو حکم دیتے ہیں۔
سُرخ تیر کی وادی کا راستہ کامران مرزا نے کیسے دریافت کیا؟
راستے میں پیش آنے والے حیرت انگیز واقعات۔
منور علی خاں پہاڑی بچھو سے مقابلہ کرتے ہیں۔
اس تمام منصوبے کے پیچھے کس کا دماغ کام کر رہا تھا؟
یہ سب کچھ جاننے کے لیے "سُرخ تیر" کا چوتھا اور آخری حصّہ

سُرخ تیر کی وادی میں

پڑھیے۔

مطبوعہ فیروز سنز لمیٹڈ لاہور۔ باہتمام عبدالسلام پرنٹر اور پبلشر

دروازہ کھلتا ہے

ٹھیک بارہ بجے ترکیب پر عمل شروع ہوا۔ کامران مرزا کو یقین تھا کہ اس وقت اس زمین دوز دنیا میں ان کے علاوہ سب سو چکے ہیں۔ انھوں نے آفتاب کو اشارہ کیا۔

آفتاب فرش سے اٹھا، جیب سے چابی نکالی اور دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھا۔ سلاخوں والے دروازے میں سے ہاتھ باہر نکال کر چابی تالے میں داخل کرنا آسان کام تھا لیکن اس میں بھی اس نے پوری احتیاط کی۔ ہلکی سی آواز بھی پیدا نہ ہوئی۔ تالا کھلتے ہی اُن کے دل خوشی سے کھل اُٹھے۔ اب وہ اس قید خانے سے باہر نکل سکتے تھے۔ سب اُٹھ کھڑے ہوئے۔

وہ دن میں مزدوروں کا بڑا کمرا دیکھ چکے تھے جس میں وہ رات کے وقت سوتے تھے۔ کامران مرزا نے اپنے ذہن میں یہ بات پہلے ہی بٹھا لی تھی کہ سب کمروں کے دروازے ایک جیسے ہیں، اس لیے گنے بغیر وہ اس ہال یا دوسرے کمروں تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ جب وہ سیر سے واپس آ رہے تھے تو ہر کمرے کا نمبر